Registered No. L. 5340

جلد ۳۲

عدد ۵

ذی القعدہ ۱۳۶۷ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قیمت سالانہ پانچ روپے

سرورق زرین پریس لاہور میں چھپا

فہرست مضامین

جلد ۳۱ | ذی القعدہ ۱۳۶۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۸ء | عدد ۵

ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر پبلشر نے کپور آرٹ پریس ایبٹ روڈ لاہور میں چھپوا کر
دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور (پاکستان) سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس مہینے مسلمانوں کو دو ایسے زبردست حادثے پیش آئے ہیں جنھوں نے ان کی قومی زندگی کو صدمۂ عظیم پہنچایا ہے۔ اس لیے ہم اُس سلسلۂ کلام کو جو گذشتہ تین اشاعتوں سے ان صفحات میں چل رہا تھا، چھوڑ کر ان حوادث پر اور ان کے اثرات و نتائج پر اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی صورت پر کچھ گفتگو کریں گے۔

پہلا حادثہ بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح مرحوم کی وفات کا ہے۔ ان کی شخصیت پچھلے دس بارہ سال سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور بنی ہوئی تھی۔ ساری قوم ان پر مجتمع تھی۔ ان کی رہنمائی پر سب کو بھروسہ تھا۔ انہی کے ذاتی اثر و رسوخ نے تمام مختلف عناصر کو جوڑ کر مسلمانوں کو ایک متحد قوم بنایا تھا۔ انہی کے اعتماد پر قوم نے اپنی پوری طاقت اس جدوجہد میں لگا دی تھی جس کے نتیجہ میں آخرکار پاکستان قائم ہوا۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد اس نئی مملکت کی عمارت جس مضبوط ستون کے سہارے پر تعمیر ہو رہی تھی وہ بھی انہی کی جامع اور معتمد علیہ شخصیت تھی۔ ان کے بعد کوئی دوسرا شخص، بلکہ کوئی پورا گروہ بھی ہمارے درمیان ایسا موجود نہیں ہے جس سے لوگوں کو محبت ہو، جس کا احترام دلوں میں جاگزیں ہو، جس کے اخلاص اور تدبّر اور عزم و ہمت پر سب کو اعتماد ہو، جس کی آواز پر تمام قوتیں حرکت میں آجائیں، اور جس کی مقناطیسی کشش ہمارے شیرازۂ قومی کے مائل انتشار اجزا کو باہم پیوستہ رکھ سکے۔ صرف ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی پاکستان کی جو کچھ ساکھ اور دھاک تھی وہ زیادہ تر اسی آزمودہ کار لیڈر کی بدولت تھی۔ کوئی دوسری شخصیت ہمارے ہاں ایسی نہیں ہے کہ اس کے وقار اور تدبر کو بین الاقوامی

برادری میں اس درجہ بھروسے اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ دنیا کے لئے تو مرحوم کی وفات محض ایک بڑے انسان اور مشہور رہنما کی رحلت ہی ہے، مگر ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑی قومی مصیبت ہے، کیونکہ اس سے ہماری نوخیز مملکت کی طاقت اور ہماری قومی زندگی کو ایسا صدمہ پہنچا ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے اور ہماری مدد کرے۔

"بے وقت موت" ایک ملحدانہ اصطلاح ہے۔ مسلمان کے نزدیک ہر موت ٹھیک اپنے وقت پر ہوتی ہے، اور خدا اس کا وقت کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ اپنی حکمت اور مصلحت کے لحاظ سے مقرر کرتا ہے۔ ایک موت ہی پر کیا موقوف ہے، خدا کی اس خدائی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے عین اپنے مناسب وقت پر ہوتا ہے اور اس وقت پر اس کے صدور میں وہ مصلحتیں ہوتی ہیں جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ جو بات ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ موت و حیات کا یہ سارا ہنگامہ ہماری آزمائش کے لئے ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ دنیا کا ہر واقعہ اور ہر حادثہ اپنے اندر خیر کا پہلو بھی رکھتا ہے اور شر کا پہلو بھی۔ انسان کی آزمائش اس میں ہے کہ وہ اس کی جانب خیر کو جذب کرتا ہے یا جانب شر کو۔ انفرادی حوادث میں افراد کی آزمائش ہوتی ہے اور قومی حوادث میں قوموں کی۔ جس شخص یا گروہ کا مزاج صالح ہوتا ہے وہ ہر تلخ و شیریں چیز اور ہر مرغوب و نامرغوب واقعہ سے اس کی بھلائیوں کو اخذ کرتا ہے اور اس کی برائیوں سے بچ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس جس کے مزاج پر فساد کا غلبہ ہوتا ہے اس کو تلخی و شیرینی، نرمی اور سختی، راحت اور مصیبت، کامیابی و ناکامی، خوشحالی اور بدحالی، ہر چیز میں شر ہی کے پہلو ملتے ہیں اور ظاہری خیر کو بھی وہ اپنے لئے شر میں تبدیل کر لیتا ہے۔ پس درحقیقت ہماری قوم اس وقت آزمائش میں ڈالی گئی ہے۔ اس کو یہ امتحان درپیش ہے کہ وہ اس حادثۂ عظیم کو اپنے حق میں سبب خیر بناتی ہے یا وسیلۂ شر۔ اگرچہ دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے نقصانات سے بچائے، مگر دعا کے ساتھ خود ہماری اپنی کوشش بھی شرط ہے۔ خدا ہر ایک کو وہی کچھ دیتا ہے جس کے لئے اس نے سعی کی ہو اور جسے اخذ کرنے کی صلاحیت واستعداد وہ اپنے اندر رکھتا ہو۔

قائد اعظم کی وفات میں شر کے پہلو تو بے شمار ہیں جنہیں ہم میں کا ہر ایک چھوٹا اور بڑا اپنے اپنے تخیل کی وسعت کے مطابق محسوس کر رہا ہے۔ مگر اس مصیبت سے جو بھلائیاں ہم جذب کر سکتے ہیں ان کی طرف کم لوگوں کی توجہ منعطف ہوئی ہے۔

اولین چیز جسے ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان خوب ذہن نشین کر لیں وہ یہ ہے کہ ان کے بھروسے اور اعتماد اور تفویض و توکل کا اصل مرکز کوئی دنیوی طاقت نہ ہونی چاہیے بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات ہونی چاہیے۔ اشخاص اور افراد ہوں یا قوی ذرائع و وسائل، بہرحال سب فنا پذیر ہیں، سب پر زوال آسکتا ہے اور اپنے وقت پر آجاتا ہے۔ جو قوم اس قسم کے سہاروں پر جئے گی اس کی اپنی زندگی بھی اتنی ہی ناپائدار ہوگی جتنے اس کے سہارے ناپائدار ہیں۔ ہماری قومی زندگی کے لئے اگر کوئی مستقل اور امٹ اور اٹل بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہم اس خدا سے اپنا تعلق مضبوط کریں جو غیر فانی اور لازوال ہے یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابوبکر صدیق نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اپنے مشہور خطبہ میں مسلمانوں کو یاد دلائی تھی کہ من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کے معبود تھے اس کا دل تو واقعی ٹوٹ ہی جانا چاہیے کیونکہ اس کا بھروسہ ایک فانی معبود پر تھا جو دنیا سے رخصت ہو گیا، مگر جس کا معبود خدا تھا اس کا دل ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ خدا زندہ ہے اور وہ بہرحال کبھی مرنے والا نہیں ہے۔

تعلق باللہ کے بعد دوسری چیز جو ہماری قومی زندگی کے قیام و استحکام اور ترقی و سربلندی کے لئے مضبوط سہارا بن سکتی ہے وہ ایک اونچے نصب العین کی محبت، ایک پاکیزہ مقصدِ حیات کا عشق، اور ایک اصولی نظام سے قلبی اور عملی وابستگی ہے۔ اشخاص و افراد بلاشبہ اجتماعی زندگی میں اپنی ایک فطری اہمیت رکھتے ہیں۔ پراگندہ قوموں کو جوڑ کر متحد کرنے اور انہیں پستی سے اٹھا کر ترقی کی راہ پر لگانے میں کچھ طاقتور شخصیتیں ہی اول اول کام کیا کرتی ہیں۔ مگر جو قوم محض کسی شخصیت کے بل پر اٹھتی ہے وہ اس شخصیت کے ہٹتے ہی گر بھی جاتی ہے۔ اس کے قیام کو دوام اور اس کے ارتقاء کو استمرار اگر کوئی چیز بخش سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس

شخصیت کے سہارے اُٹھنے کے بعد وہ کوئی ایسا نصب العین پالے جس کی کشش اسے ہمیشہ کھینچتی رہے، کوئی ایسا مقصدِ زندگی پالے جس کے عشق میں وہ پیہم سرگرم عمل رہے، اور کچھ ایسے اصول پالے جن کی بنیاد پر وہ اپنی حیات قومی کی عمارت مستحکم کر سکے۔ شخصیتیں بہر حال فانی ہوتی ہیں۔ ان کے بل پر قوم اُٹھ تو سکتی ہے مگر قائم نہیں رہ سکتی۔ قائم رہنے کے لئے اسے ان چیزوں کی ضرورت ہے جن کی عمر اشخاص و افراد کی عمر سے زیادہ ہو، جو مردان کار کی موت کے ساتھ مر نہ جائیں بلکہ نسل بر نسل ان سے گرمی، حرکت اور طاقت پاتی چلی جائے۔

یہی بات تھی جو جنگ احد کے موقع پر قرآن مجید میں فرمائی گئی تھی کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ۔ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک پیغام کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغام بر آکر جا چکے ہیں۔ اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دئے جائیں تو کیا تم اپنی سابق جاہلیت کی طرف پلٹ جاؤ گے"؟ یعنی اگر تمہیں محض شخصیتِ محمد صلی اللہ علیہ سے وابستگی ہے تو تمہارا یہ شیرازہ محض وقتی اور عارضی ہے، اُن کے ہٹتے ہی تم پھر پراگندہ ہو جاؤ گے اور اسی جاہلیت میں مبتلا ہو جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے۔ لیکن اگر اس شخصیت کے ذریعہ سے تم نے ایک نصب العین، ایک مقصدِ حیات، اور ایک نظام زندگی پالیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا ثبات و قیام اس ذریعہ کی موجودگی پر ہی منحصر رہے۔ نہیں اس کے ہٹ جانے پر بھی تم اپنے اسی مقصد کے لئے جیو گے، اسی نصب العین کے لئے کام کرتے رہو گے، اور اسی نظام سے وابستہ رہو گے۔

قائداعظم کی وفات کے بعد ہمارے لئے اب یہ سوال پہلے سے بھی بدرجہا زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ کیا ہم کوئی ایسا مرکزی تخیل رکھتے ہیں جو ہمارے مختلف عناصر کے احزابی تخیلات پر غالب آگیا ہو اور ان سب کو اپنی مقناطیسیت سے جوڑ کر ایک وحدت بنا سکتا ہو؟ کیا ہم کوئی ایسا اجتماعی مقصد رکھتے ہیں جو افراد اور قبائل اور خاندانوں اور طبقوں کے جداگانہ مقاصد کو کھا جائے اور یہ سب اس ایک بڑے مقصد کی خدمت میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیں؟ کیا ہم کچھ ایسی قدریں رکھتے ہیں جن کی طلب اور لگن ہمارے

بچے بچے کے دل میں پیدا ہو چکی ہو اور وہ ان کے حفظ و بقا اور نشو و ارتقاء کو اپنے نفس اور اس کی محبوب اور خواہشوں سے عزیز تر سمجھتا ہو؟ آیا ہم کچھ ایسے اصول رکھتے ہیں جن کے اتباع سے ہم اپنی حیاتِ قومی کو عدل و انصاف، تعاون و تناصر، امن و اطمینان اور ترقی و تقدم کی پائیدار بنیادوں پر قائم کر سکیں اور ان اسباب کو مٹا سکیں جو ہمارے عناصرِ وجود کو آپس ہی کی کشمکش میں مبتلا کر دینے والے ہیں؟

یہ چیزیں اگر ہمارے پاس موجود ہیں تو ہمیں مطمئن رہنا چاہیے کہ پاکستان مستحکم ہے، محفوظ ہے، اور بقا و ارتقا کی پوری طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اگر دیانتہً ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا ہمارے اندر فقدان ہے، یا کم از کم اس حد تک قلت ہے کہ ان کی موجودگی سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، تو پھر ہمیں سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر یہ فکر ہونی چاہیئے کہ انہیں پیدا کریں اور نشوونما دیں، کیونکہ اب وہ شخصیت بھی باقی نہیں رہی ہے جس کی جاذب اور محرک طاقت ان کے فقدان کی کسی حد تک تلافی کر رہی تھی۔

مسلمانوں کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی تو اس کے لئے یہ امر بجائے خود کافی پریشان کن ہوتا کہ وہ ایسا تخیل، ایسا مقصد، ایسی قدریں، ایسے اصول کہاں سے لائے۔ اس کو یہ ساری چیزیں کچھ خود تصنیف کرنی پڑتیں، کچھ جگہ جگہ سے مانگ تانگ کر لانی پڑتیں، اور انہیں اپنے اندر جذب کرنے کے لئے برسہا برس تک محنت کرنی پڑتی۔ لیکن مسلمانوں کے پاس اسلام کی شکل میں یہ سب کچھ موجود ہے، اور صدیوں کی روایات پہلے ہی اس کی جڑیں ہماری زندگی میں پھیلا چکی اور گہری اتار چکی ہیں۔ صرف ہماری غفلت ہے جس نے اسے مضمحل کر رکھا ہے، اور اسی کی بدولت ہم قوت و استحکام کے اس لازوال اور اتھاہ خزانے سے محروم ہو رہے ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس کی طرف توجہ کریں، اس کو تازہ کریں، اور اس کے ساتھ کبھی کبھار کے زبانی اشتغال پر قناعت کرنے کے بجائے بالفعل اس کو استعمال کریں؟

بلاشبہ بیرونی خطرات کا ڈر بھی ایک قوم کو متحد کر سکتا ہے، اس کے اندرونی اختلافات کو دبا سکتا

اس کی سوئی ہوئی طاقتوں کو بیدار کرسکتا ہے اور اس کے اندر بہت سے اُن اوصاف کو ابھار سکتا ہے جو تعمیر و استحکام کے لئے مددگار ہوتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ڈر فی الحقیقت کوئی تعمیری طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک وقتی چیز ہے۔ اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم انحصار نہیں کرسکتے۔ وہ ایک سلبی چیز ہے۔ اس سے ہمارے اندر وہ ساری قوتیں نہیں ابھر سکتیں جو اپنی حیات قومی کی تعمیر اور اس کے نشو و نما کے لئے ہمیں مطلوب ہیں۔ وہ فائدے کے ساتھ مضرت کے پہلو بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر صرف اسی پر ہماری تعمیر و استحکام کا مدار ہو تو ہم اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ایک استبدادی نظام مسلط کرسکتے ہیں، اپنی فلاح و سعادت کے بہت سے گوشوں سے جان بوجھ کر غفلت برت سکتے ہیں، اپنی بہتری کے بہت سے کاموں کو ضائع کرسکتے ہیں، اور ان قوموں کی راہ پر پڑ سکتے ہیں جنہوں نے صرف بیرونی خطرات کے خوف پر اپنی زندگی کا مدار رکھا اور آخر کار اتنی تنگ، وہمی، چڑچڑی، بدمزاج ہو گئیں کہ انہوں نے خود اپنے رویہ سے اپنے لئے اُن خطرات کو واقعی مہلک بنا لیا جن سے وہ بچنا چاہتی تھیں پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ بیرونی خطرات کے احساس سے جو زیادہ سے زیادہ اندرونی استحکام ممکن ہے وہ بھی زیادہ دیر تک ہمارے اندر اجتماعی عدل و انصاف کے نقدان کی تلافی نہیں کرسکتا۔ ہم خود اگر اپنے کسی بھائی پر ظلم کر رہے ہوں تو آخر کب تک وہ کسی بیرونی ظالم کے ڈر سے ہمارے ساتھ چمٹا رہیگا؟ ہماری شکم سیری، اپنے ایک بھائی کی فاقہ کشی کو آخر کتنی دیر تک اس وعظ سے متاثر کرسکیگی کہ یہ پُرخطر وقت تجھ سے قربانیوں کا طلبگار ہے؟

پس بیرونی خطرات، جو فی الواقع موجود ہیں، اپنی حقیقی فطری حد تک ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ایک استحکامی و تعمیری طاقت کی حیثیت سے محض انہی پر انحصار کرلینا درست نہیں ہے۔ اس غرض کیلئے تو ہمیں کوئی ایجابی چیز چاہیئے جو دائمی اور مستقل ہو، جس کی قوتِ جاذبہ سے ہم جڑ جائیں۔ جس کی قوت محرکہ سے ہم متحرک ہو جائیں، جو ہماری تمام تعمیری قوتوں اور صلاحیتوں کو ابھار دے، اور جس کے فیض سے ہماری زندگی اپنے گھر میں بھی صالح ہو اور باہر والوں کے لئے بھی اسوۂ حسنہ بن جائے۔

دوسرا زبردست حادثہ جو ان دنوں ہماری قوم کو پیش آیا ہے وہ حیدرآباد کا سقوط ہے۔ اس معاملہ میں انڈین یونین اور اس کے لیڈروں نے جو شرمناک پارٹ ادا کیا ہے اس سے بحث کرنا ہمارے لئے لاحاصل ہے۔ ہندوستان میں اگر کچھ عقل و ہوش رکھنے والے لوگ موجود ہیں تو یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ ان کی قوم کدھر جارہی ہے اور کہاں پہنچ کر رہیگی۔ ہم اپنی بحث کو معاملہ کے صرف اس پہلو تک محدود رکھینگے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔

حیدرآباد میں چند لاکھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہجرت کے بعد مسلمانوں کی آبادی تقریباً چالیس لاکھ تھی۔ یہ چالیس لاکھ مسلمان ایک ایسی ریاست میں آباد تھے جس میں غیر مسلموں کی آبادی سوا کروڑ سے بھی زیادہ تھی۔ پھر اس ریاست کو چاروں طرف سے ایک ایسی مملکت گھیرے ہوئے تھی جس کی آبادی ۳۰ کروڑ سے زائد ہے اور جس میں حکمرانی اسی غیر مسلم اکثریت کی ہے جو خود ریاست میں بھی اکثریت ہی رکھتی ہے۔ والیٔ ریاست انہی والیان ریاست کی جنس سے تعلق رکھتا تھا جو اپنی گدی اور اپنے خانوادے کے مفاد کو بہرحال اپنی پوری قوم کی بہ نسبت عزیز تر رکھتے ہیں۔ فوج، پولیس اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں اگرچہ مسلمانوں کا غلبہ تھا، مگر غیر مسلم عنصر بھی کچھ ایسا بے اثر نہ تھا کہ حکومت کی انتظامی مشین کو بالکل مسلمانوں کی حمایت میں استعمال کیا جاسکتا۔ تقسیم ہند کے وقت تک ریاست پر انگریزوں کی بالادستی مسلط رہی تھی اور اس نے دوسری ریاستوں کی طرح حیدرآباد کو بھی ایسا کوئی موقع نہ دیا تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت مضبوط کر سکے۔ اور تقسیم کے بعد حیدرآباد انڈین یونین کے گھیرے میں آچکا تھا، اس لئے نہ باہر سے کوئی بڑی مدد اس کو پہنچ سکتی تھی اور نہ اندر ہی اس کا کوئی امکان تھا کہ چند مہینوں میں وہ اتنی جنگی طاقت فراہم کر سکے جو ہندوستان سے لڑنے کے لئے کچھ بھی کافی ہو۔ اخلاقی حیثیت سے بھی حیدرآباد کے مسلمان کچھ ایسے برتر نہ تھے کہ کوئی شخص یہ تصور کر سکتا کہ وہ اپنے سے ستر گنی طاقت کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اور اس کا بھی کوئی امکان نہ تھا کہ پاکستان اپنے موجودہ حالات میں ان کی حمایت کے لئے اٹھ سکے۔

یہ تھے حیدرآباد کے اصل حالات۔ ان حالات میں کوئی ہوشمند انسان یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں

۸۵ فیصدی غیر مسلم اکثریت پر ۱۵ فیصدی مسلم اقلیت کا وہ غلبہ و اقتدار برقرار رکھا جا سکتا ہے جو پہلے بالکل مختلف حالات میں قائم ہوا اور رہا تھا۔ اور کسی مرد عاقل سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ حیدرآباد انڈین یونین سے لڑ کر اس کے علی الرغم اپنی خود مختاری قائم نہیں رکھ سکتا۔ دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان کشمکش، مزاحمت اور جنگ کے بجائے اپنے مستقبل کے لئے کوئی ایسی راہ تلاش کرتے جس میں وہ کامل تباہی سے بچ بھی سکتے اور آئندہ اپنی اخلاقی و دینی حالت کو بہتر بنا کر کوئی نتیجہ خیز جد و جہد کرنے کے مواقع بھی انھیں حاصل رہتے۔ لیکن جن لوگوں نے ایسی کوئی راہ سوچی اور بتائی وہ مسلمانوں کو دشمن نظر آئے۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کے لئے ایسے لوگوں کو پسند کیا جو اندھے جوش، کھوکھلے نعروں، جھوٹی توقعات، غلط امیدوں، بے بنیاد آرزوؤں، اور بے زور لاف و گزاف کے ذریعہ سے ان کے غرور نفس کو فی الوقت تسکین دے سکیں۔ وہ اس آواز پر مرمٹے کہ کوئی دلی کے لال قلعہ پر آصف جاہی جھنڈا گاڑ دینے کی بات تو کرتا ہے۔ اس نشے میں چالیس لاکھ کی پوری آبادی مست ہو گئی۔ کوئی یہ سوچ کر اپنے وقتی لطف کو کرکرا کرنے پر راضی نہ ہوا کہ آخر یہ کام ہو گا کس طرح؟ سب کے سب آنکھیں بند کر کے اس لاف زنی کے پیچھے چل پڑے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی انہیں ایسے بے نظیر لیڈر میسر آئے ہی چلے جاتے ہیں!

یہ تو تھی حیدرآباد کے مسلمانوں کی کیفیت۔ رہے پاکستان کے مسلمان تو ان کی کیفیت بھی اُن سے کچھ مختلف نہ تھی۔ سیاسی تقسیمات نے چاہے ہم کو کتنا ہی بانٹ دیا ہو، مگر قوم اور اس کا مزاج تو ایک ہی ہے۔ یہاں ہمارے اخبارات وہ ساری نشہ آور تقریریں پھیلا رہے تھے جن سے حیدرآباد کے لوگوں پر سنسنی کا عالم طاری کیا جا رہا تھا۔ حیدرآباد کی روز افزوں طاقت اور اس کی زبردست تیاریوں کے متعلق طرح طرح کے افسانے نہ معلوم کہاں تصنیف ہوتے تھے اور عام لوگوں تک پہنچا دئے جاتے تھے۔ کبھی ہمیں سنایا جاتا تھا کہ حیدرآباد کے پاس بڑا بھاری ہوائی بیڑہ موجود ہے۔ کبھی کہا جاتا تھا کہ اس نے گوآ کی بندرگاہ حاصل کر لی ہے۔ کبھی خبر دی جاتی تھی کہ اس نے فرانس سے ایک جزیرہ حاصل کر لیا ہے۔ کبھی اس کی فوجی طاقت اور جنگی سروسامان کے متعلق سراسر بے سروپا

اندازے شائع کئے جاتے تھے۔ کبھی بتایا جاتا تھا کہ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اس کی مدد کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان باتوں سے محض عوام الناس ہی نہیں، ہمارے اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ اور ذمہ دار منصب رکھنے والے اصحاب تک جھوٹی اُمیدوں اور غلط توقعات کے قلعے بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ حتیٰ کہ جس روز شام کو حیدر آباد ہتھیار ڈالنے والا تھا اس کی دوپہر تک ہمارے خطیب اپنے جمعہ کے خطبوں میں اپنی قوم کو یہ یقین دلائے جا رہے تھے کہ عنقریب لڑائی کا نقشہ بدلنے والا ہے اور اس کے بعد...... بس دیکھنا کہ کیا ہو جائیگا۔ پھر جب تلخ حقائق کی ایک ضرب نے وہ تمام خیالی قلعے یک لخت منہدم کر دئے جو ہوا باندھ کر پچھلے ایک سال سے تعمیر ہو رہے تھے، تو اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

آج حیدر آباد میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تصور سے ہر مسلمان کا دل غمگین ہے۔ جہاں سات آٹھ سو برس تک مسلسل مسلمانوں کا غلبہ رہا آج وہاں مسلمان صرف مغلوب ہی نہیں پامال ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی وسیع سرزمین پر وہ ایک خطہ بھی اب باقی نہیں رہا جہاں مسلمان عزت سے سر اٹھا کر چل سکتا تھا۔ کل تک جس حیدر آباد کی طرف سارے ہندوستان کے مسلمان اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، افسوس! آج وہی حیدر آباد ہر طرف مایوسی ہی مایوسی دیکھ رہا ہے۔ اس کے عزت والے ذلیل ہو رہے ہیں۔ اس کے بہترین نوجوان ضائع کئے جا رہے ہیں۔ اور اس کی طاقت اس طرح توڑی جا رہی ہے کہ شاید چند سال بعد ہندوستان میں کسی خطّے کے مسلمان اتنے خستہ حال نہ ہونگے جتنے حیدر آباد کے مسلمان۔

اپنے بھائیوں کے اس انجام پر ہمارا غم و افسوس صحیح۔ انڈین یونین کی بدعہدیوں اور کم ظرفیوں اور خرمستیوں پر ہمارا غصہ بجا۔ برطانوی حکومت کے غدارانہ رویہ پر ہماری شکایت درست۔ اور نظام کی خود غرضی پر بھی ہمارا غیظ و غضب برحق۔ مگر ہم کبھی اس طرح کی ٹھوکریں کھانے اور چوٹیں سہنے سے نہیں بچ سکیں گے جب تک کہ خود اپنی اُن غلطیوں کو محسوس نہ کریں جن کی بدولت یہ پے درپے

رکیں ہمیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ ہم حقائق سے منہ موڑ کر آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے چلتے ہیں۔ ہم عقل کی بات بتانے والوں کو دشمن اور خوش کن باتیں بنانے والوں کو دوست سمجھتے ہیں۔ ہم ٹھوس عمل کی کمی کو خیالی ہواؤں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نصیحت سے نفور اور کذب و فریب کے قدرداں ہیں۔ ہم کسی کو اپنے آگے لگاتے وقت اس کے اخلاقی و ذہنی اوصاف نہیں دیکھتے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نعرہ کتنے زور کا لگاتا ہے اور زبان کے استعمال میں کس قدر مطلق العنان ہے۔ ہم اپنے رہبروں اور سربراہ کاروں کے انتخاب میں پیہم غلطیاں کرتے رہے ہیں اور اندھی پیروی کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ تباہ کن حوادث میں مبتلا ہونے سے پہلے کبھی آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے رہبر ہمیں کدھر لئے جا رہے ہیں۔ ہماری یہی کمزوریاں دراصل ہماری سب سے بڑی دشمن ہیں۔ کسی باہر والے کی دشمنی اور کسی گھر والے کی غداری ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتی اگر ہماری اپنی یہ کمزوریاں اس کی مدد نہ کرتیں۔ اب بھی ہم انہیں سمجھ لیں اور ان کی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حیدرآباد کا خون رائگاں نہ گیا۔ لیکن افسوس کہ سقوط حیدرآباد کے بعد فوراً ہی ہم نے اس کی ایسی توجیہات شروع کر دیں جن سے اپنی کمزوریوں کے سوا ہر دوسری ممکن التصور چیز پر اس حادثۂ عظیم کی ذمہ داری ڈالی جا سکے۔ گویا ہم اپنے نفس کو یہ اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ ہم خود تو سب کچھ ٹھیک ہی کر رہے تھے، صرف فلاں کی غداری اور فلاں کی بے وفائی نے ہم کو اس حادثہ سے دوچار کر دیا — درحقیقت یہ وہ افیون کی گولیاں ہیں جو ہر چوٹ کے بعد ہم اس لئے کھایا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی خامیوں کا تلخ احساس نہ ہونے پائے!

قدیم زمانے میں اقتدار و اختیار کا مرکز بادشاہ ہوتے تھے اور اجتماعی زندگی کے سارے کارخانے کی درستی یا خرابی کا انحصار اس پر ہوتا تھا کہ وقت کا بادشاہ کیسا ہے۔ بادشاہ عقلمند اور نیک مزاج ہوتا تو وہ اپنے گرد و پیش اچھے مشیر، راستباز علماء، دانشمند مدبر، اور دیانتدار کارکن جمع کر لیتا تھا اور سب کام ٹھیک چلتے تھے۔ لیکن اگر تخت شاہی پر کوئی بگڑا ہوا شاہزادہ متمکن ہو جاتا تو اسے

خوشامدی مصاحب ہر طرف سے گھیر لیتے تھے اور وہ اسے بھروں پر چڑھا کر غلطیوں کے چکر میں ایسا پھانستے تھے کہ صرف شاہی خاندان ہی نہیں بلکہ پوری مملکت تباہی و بربادی کی راہ پر چل پڑتی تھی۔ سلطنت کمزور ہوتی تھی اور وہ بادشاہ کو یقین دلاتے تھے کہ حضور کی طاقت آسمان پر جا رہی ہے۔ دشمن سر پر ہوتا تھا اور وہ بادشاہ کو اطمینان دلاتے تھے کہ حضور کا اقبال سب کا منہ پھیر دیگا۔ بادشاہ کے کانوں تک وہ کوئی صحیح رائے، کوئی نیک مشورہ، اور کوئی حق بات نہ پہونچنے دیتے تھے۔ دربار میں مانگ ہی ان لوگوں کی ہوتی تھی جو بادشاہ کو دھوکے اور فریب میں مبتلا رکھیں، اس کو جھوٹ سے خوش کریں، اس کی کمزوریوں کو خوبیاں بتائیں، اس کے گناہ کو صواب ٹھیرائیں، دنیا کی ساری حقیقتوں کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالیں اور کسی تلخ حقیقت سے اس کے عیش کو بدمزہ نہ ہونے دیں۔ اس ماحول میں کوئی ناصح مشیر، کوئی حق گو عالم، کوئی دور اندیش اور معاملہ فہم انسان اور کوئی مخلص و متدین ملازم بادشاہ کے پاس نہ پھٹک سکتا تھا، اور اگر اتفاق سے کوئی ایسا آدمی نکل بھی آتا تو بد اندیشوں کی پوری ٹولی مل کر اپنا سارا زور اس کے خلاف لگا دیتی تھی تاکہ بادشاہ کا مزاج اس پر برہم ہو جائے اور اسے دربار سے نکال باہر کیا جائے۔ پھر جب یہ ساری خرابیاں مل جل کر سلطنت پر کوئی بڑی آفت لے آتیں تو افیون کے بہت سے انٹے اور شراب کے ساغر اور بھنگ کے پیالے تیار رکھے جاتے تھے تاکہ اعلیٰ حضرت کی آنکھیں کھلنے سے پہلے انہیں غفلت میں سرشار کر دیا جائے۔

آج اس جمہوریت کے دور میں عوام کا وہی مقام ہے جو پہلے بادشاہوں کو حاصل تھا۔ اقتدار و اختیار کا منبع اب بادشاہ نہیں، ملک کے عوام ہیں۔ زندگی کا سارا نظام اسی وقت ٹھیک چل سکتا ہے جبکہ عوام الناس کا شعور درست ہو، ان میں بھلے اور برے کی تمیز ہو، اور وہ ٹھیک ٹھیک سمجھیں کہ کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہ کرنا چاہیے۔ یہ بات جہاں نہ ہوگی وہاں وہی صورت حال رونما ہوگی جو پہلے شخصی بادشاہی کے دور میں کسی بگڑے ہوئے شاہزادے کے تخت نشین ہونے پر رونما ہوا کرتی تھی۔ اب مصاحبوں کا زمانہ نہیں ہے۔ ان کی جگہ اب گمراہ کن اخباروں اور بے لگام خطیبوں اور الکشن کے کھلاڑیوں اور دنیا پرست مولویوں نے لے لی ہے۔ پہلے بگڑے ہوئے عوام ان کو پسند کر کے ابھارتے ہیں، پھر یہ ابھر کر عوام کو اور زیادہ بگاڑتے چلے جاتے ہیں۔

جماعتِ اسلامی کی دعوت

[پچھلے سال ۹۔۱۰ مئی کو دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں جماعت اسلامی کا جو اجتماع منعقد ہوا تھا، افسوس ہے کہ اس کی روداد مشرقی پنجاب کے فسادِ عظیم کی نذر ہوگئی بلکہ اس کے مسوّدات کا بھی بڑا حصہ دیناگر میں ہمارے کاتب کی خانہ بربادی کے ساتھ تلف ہوگیا۔ اب خوش قسمتی سے کاغذات میں میری دو تقریروں کے مسودے مل گئے ہیں جنہیں اجتماع کے بعد قلمبند کیا گیا تھا۔ پہلی تقریر افتتاحی تقریر تھی جس میں جماعت اسلامی کے مقصد کی تشریح کی گئی تھی۔ دوسری تقریر جلسۂ عام میں کی گئی تھی اور اس میں "بناؤ اور بگاڑ" کے متعلق سنت اللہ کو تفصیل بیان کیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں تقریریں ڈیڑھ سال پرانی ہو چکی ہیں، مگر ان کا مضمون پرانا نہیں ہوا ہے۔ توقع ہے کہ ان کا مطالعہ ناظرین کے لئے فائدے سے خالی نہ ہوگا۔]

رفقا اور حاضرین! سب سے پہلے میں آپ سب حضرات کو خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے اور اسی کی خوشنودی چاہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ہماری اس دعوت کا سارا انحصار ہی تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ پر ہے۔ کوئی شخص خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا، بلکہ سچ یہ ہے کہ خود راہ راست پر قائم بھی نہیں رہ سکتا، اگر خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو اور تقویٰ کی گرفت اس کی خواہشات پر مضبوط نہ ہو اور اس کی تمام سعی و جہد اور دوڑ دھوپ میں رضائے الٰہی کی طلب کارفرما نہ ہو۔ دنیا میں آدمی کی راست روی کی ضامن صرف ایک ہی چیز ہے، اور وہ ہے خدا کا خیال۔ یہ خیال اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی دل سے نکل جائے، اگر ذرا سی غفلت بھی طاری ہو جائے، تو انسان کا قدم سیدھی راہ سے ہٹنے لگتا ہے۔ پھر جسے محض راہ راست پر چلنا ہی نہ ہو بلکہ دنیا کو اس پر چلانا اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف کھینچ کر لانا بھی ہو، اس کے لئے تو ناگزیر ہے کہ خدا سے اس کا تعلق ہر وقت مضبوط اور خدا کی طرف اس کی توجہ ہر آن مرکوز رہے، ورنہ اس سے غافل ہوکر وہ اپنے آپ کو مصلح سمجھتے ہوئے نہ معلوم کس کس قسم کے فسادوں کا مرتکب ہو جائیگا۔ لہٰذا میری پہلی نصیحت آپ کو

اور ان سب لوگوں کو جو اس تحریک میں حصہ لینا چاہیں یہ ہے کہ اپنے ذہن میں اللہ کی ذات و صفات کا تصور ہر وقت تازہ رکھیں اور اپنے تمام کاموں میں اسی کی خوشنودی پر نظر جائے رہیں۔ جن تحریکوں کے پیش نظر صرف دنیا اور اس کے معاملات ہی ہیں وہ تو چل سکتی ہیں بغیر اس کے کہ خدا کا خیال کبھی دل میں آئے، مگر یہ تحریک ایک قدم بھی ٹھیک نہیں چل سکتی جب تک کہ اس کے خادم پورے شعور کے ساتھ خدا سے خشیت اور تقویٰ اور رضا طلبی کا تعلق نہ جوڑے رکھیں۔

دوسری چیز جس کی میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں، یہ ہے کہ آپ صرف اس اجتماع میں بلکہ اپنے تمام اجتماعی کاموں میں نظم و ضبط اور سکون و وقار اور اسلام کے دوسرے اجتماعی آداب کی پوری پوری پابندی ملحوظ رکھیں۔ بلاشبہ اس معاملہ میں آپ نے پچھلے چند برسوں کے اندر نمایاں ترقی کی ہے جس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، یہ محض خدا کا فضل اور اس کے دین کی برکت ہے کہ آپ اتنی قلیل مدت میں اپنے اجتماعی برتاؤ کو اس قدر منظم، مہذب اور باوقار بنانے میں کامیاب ہو گئے جو اب بھی اپنی ابتدائی حالت ہی میں، اس ملک کی تمام دوسری جماعتوں پر بیّن امتیاز رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ آخری حد ہے جس پر آپ پہنچ چکے ہیں۔ ابھی آپ کو اپنی بہت سی خامیوں کی تلافی کرنی ہے۔ بہت سی اجتماعی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنا ہے، اور ابھی بہت فاصلہ پر ہے وہ حد کمال جس پر آپ کو پہنچنا ہے۔ آپ اپنے مقصد کے لئے دنیا کی جن زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں جدوجہد کرنے اٹھے ہیں وہ آج نظم و ضبط کی انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کا نظم ابھی کسی شمار میں آنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر آپ کے پیش نظر محض کسی ایک چھوٹے یا بڑے علاقے میں صرف انتظام کرنے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ سرے سے اس نظام کو بدل دینا ہے جس پر نوع انسانی کی زندگی کا انتظام اس وقت چل رہا ہے، تو آپ کو سمجھنا چاہئے کہ اس غرض کے لئے آپ کو آخری فیصلہ کن مقابلہ ہندوستان کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ مغرب کے اماموں سے پیش آئے گا۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پوری پوری قوموں کو باقاعدہ سوچنے، باقاعدہ کام کرنے اور

منتظم اجتماعی سعی کرنے کی ایسی مکمل تربیت دی ہے جس کے ثمرات پچھلی جنگ میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ جنگ کیسی تھی اور کتنے ناپاک مقاصد کے لئے تھی۔ غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ دنیا کے ان مفسد اماموں نے تنظیم اور انضباط اور مرتب اجتماعی عمل کا جو کمال دکھایا ہے کیا اس کے مقابلہ میں کوئی مصلح امامت کبھی قائم ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ ان صفات میں ان سے بازی نہ لے جائے؟ پہلے بھی امامت دنیا میں انقلاب اسی وقت آیا تھا جب صحابۂ کرام نے محض اپنے عقیدہ ومقصد کی پاکیزگی اور اپنے اخلاق کی فضیلت ہی سے نہیں بلکہ اپنی تنظیم سے بھی دنیا کے آئمۂ شر کو شکست دے دی تھی۔ اور اب بھی یہ انقلاب اس کے بغیر رونما نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس کے خواہشمند ہیں وہ اپنے آپ کو افکار، اخلاق اور انتظامی صلاحیت میں دنیا کے موجودہ منتظمین سے فائق تر ثابت کر دیں۔

تیسری بات جس کی طرف میں اس موقع پر آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ آپ اجتماع کے ان دنوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں میں وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ دو تین دن جو سال میں ایک مرتبہ آپ کو ملتے ہیں، ان کو غنیمت سمجھئے اور ان کے ایک ایک لمحے کو اپنے نصب العین کی خدمت کے لئے استعمال کیجئے۔ دوسری باتوں کے لئے دوسرے اوقات بہت ہیں۔ اگرچہ ایک وہ شخص جو اس مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکا ہو، دوسرے اوقات میں بھی اپنے ذہن کو دوسری فکروں میں الجھانا اور اپنی قوت کو دوسری غیر متعلق باتوں میں صرف کرنا پسند نہ کرے گا، لیکن خصوصیت کے ساتھ اجتماع کے ایام میں تو کسی شخص کا دوسری باتوں اور دلچسپیوں میں مشغول ہونا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ اُسے اپنے اس نصب العین کے ساتھ کوئی دلی لگاؤ نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی پوری جماعتی طاقت ایک جگہ مجتمع ہے۔ تمام مختلف مقامات کے رفقا یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ بہت سے کارکن ہمدرد، عام متاثرین اور جدید الحال اصحاب بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اس قیمتی موقع سے پورا فائدہ اٹھائیے۔ دور و نزدیک کے رفقاء سے تعارف پیدا کیجئے۔ باہم سر جوڑ کر مشورے کیجئے۔ آپس میں تعاون کی تدبیریں سوچئے۔ ہمدردوں کے جذبۂ اخلاص وعمل کو ابھاریئے اور نئے لوگوں کو اپنی

دعوت سمجھائیے اور اپنی تمام فکر کو اس سوال پر مرکوز کر دیجئے کہ ہم اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کس کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ کو چاہیئے کہ اجتماعات کے لئے جب آپ نکلیں اُس وقت سے لے کر اپنے گھروں کو واپس ہونے تک اپنے آپ کو راہِ خدا میں سمجھیں اور اس دوران میں آپ کی ساری فکر، تمام توجہ اور پوری مصروفیت اسی دعوتِ حق اور اس کے متعلق امور کے لئے وقف ہو۔

اب میں چند الفاظ اُن حضرات سے بھی کہنا چاہتا ہوں جو یہ معلوم کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں کہ یہ اجتماع کیسا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ان میں سے بعض تو ہم سے کچھ نہ کچھ پہلے بھی واقف ہوں گے، مگر بعض ایسے بھی ضرور ہونگے جو آج پہلی مرتبہ ہم سے روشناس ہو رہے ہیں۔ ایسے اصحاب ہماری پوری بات تو ہمارے لٹریچر کے مطالعہ ہی سے سمجھ سکتے ہیں، مگر میں کوشش کروں گا کہ مختصر الفاظ میں اس جماعت کی دعوت کا خلاصہ صاف اور واضح طور پر ان کے سامنے پیش کر دوں تاکہ یہ تعارف ان کے تفصیلی مطالعہ کے لئے مددگار ہو سکے۔

ہماری یہ جماعت جس غرض کے لئے اٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں، اور آغاز کار کے طور پر اس ملک میں، ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو، دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمائندگی کرے، اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت جڑ پکڑ جائے وہاں کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست اور معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت و مادہ پرستی کی بنیادوں سے اکھاڑ کر سچی خدا پرستی، یعنی توحید کی بنیاد پر قائم کر دے۔ اس جماعت کو یہ یقین ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کا پورا نظامِ زندگی جن اصولوں پر قائم ہے وہ قطعاً فاسد اصول ہیں اور اگر دنیا کا انتظام انہی اصولوں پر چلتا رہا تو وہ بڑے ہولناک نتائج سے دوچار ہوگی ـــــ اس کے جو نتائج اب تک نکل چکے ہیں وہ بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہیں، مگر انہیں کوئی نسبت اس انجام کی ہولناکی سے نہیں ہے جس کی طرف یہ تہذیب دنیا کو لئے جا رہی ہے ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا سے کہیں باہر نہیں جی رہے ہیں بلکہ اس کے اندر ہی سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان اصولوں کو فاسد اور بد انجام سمجھتے ہوئے بھی منفعلانہ طریقے سے

(Passively) اسی نظام کے تحت زندگی بسر کئے چلے جائیں اور تہذیب حاضر کے مغربی اماموں اور مشرقی مقلدوں کی پیشوائی و سربراہ کاری کے آگے سپر ڈالے رہیں تو جس تباہی کے گڑھے میں یہ دنیا گرے گی اسی میں اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی جا گریں گے اور ہم اس انجام کے مستحق ہونگے۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں، اور اپنے اس علم پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے انسان کی رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایت نازل کی ہے اسی کی پیروی میں ہماری اور سب انسانوں کی فلاح مضمر ہے، اور انسانی زندگی کا پورا نظام اسی وقت صحیح چل سکتا ہے جبکہ اسے اُن اصولوں پر قائم کیا جائے جو انسانوں کے خالق کی دی ہوئی اس ہدایت میں ہم کو ملتے ہیں۔ ہمارے اس علم و یقین سے یہ فرض خود بخود ہم پر عائد ہو جاتا ہے ـــــ اور یہی فرض خدا نے بھی اپنے مطیع فرمان بندوں پر عائد کیا ہے ـــــ کہ ہم اُس نظام زندگی کے خلاف جنگ کریں جو فاسد اصولوں پر چل رہا ہے اور وہ صالح نظام قائم کرنے کے لئے جد و جہد کریں جو خدائی ہدایت کے دئے ہوئے اصولوں پر مبنی ہو۔ یہ کوشش ہمیں صرف اسی لئے نہیں کرنی چاہیئے کہ دنیا کی خیر خواہی ہم سے اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ نہیں، ہم خود اپنے بھی سخت بدخواہ ہونگے اگر اس سعی و جہد میں اپنی جان نہ لڑائیں۔ کیونکہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب باطل نظریات و افکار ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں، جب خیالات کو ڈھالنے اور اخلاق و سیرت کو بنانے کی عالمگیر طاقتوں پر فاسد نظام تعلیم، گمراہ کن ادبیات، فتنہ انگیز صحافت اور شیطنت سے لبریز ریڈیو اور سنیما کا تسلط ہو، جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسے معاشی نظام کا قبضہ ہو جو حرام و حلال کی قیود سے ناآشنا ہے، جب تمدن کی صورت گری کرنے اور اس کو ایک خاص راہ پر لے چلنے کی ساری طاقت ایسے قوانین اور ایسی قانون ساز مشینری کے ہاتھ میں ہو جو اخلاق و تمدن کے سراسر مادہ پرستانہ تصورات پر مبنی ہیں، اور جب قوموں کی امامت اور انتظام دنیا کی پوری زمام کار اُن لیڈروں اور حکمرانوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا کے خوف سے خالی اور اس کی رضا سے بے نیاز ہیں اور اپنے کسی معاملہ میں بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان کے خالق کی ہدایت اس معاملہ میں کیا ہے، تو ایسے نظام کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم خود اپنے آپ کو ہی اس کے بُرے اثرات اور بدتر نتائج سے

کب بچا سکتے ہیں۔ یہ نظام جس جہنم کی طرف جا رہا ہے اسی طرف وہ دنیا کے ساتھ ہمیں بھی گھسیٹے لئے جا رہا ہے۔ اگر ہم اس کی مزاحمت نہ کریں اور اس کو بدلنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور نہ لگائیں تو یہ ہماری اور ہماری آئندہ نسلوں کی دنیا خراب اور عاقبت خراب تر کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا محض دنیا کی اصلاح ہی کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے بچاؤ کے لئے بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے ـــــ اور یہ سب فرضوں سے بڑا فرض ہے ـــــ کہ ہم جس نظامِ زندگی کو پوری بصیرت کے ساتھ فاسد و مہلک جانتے ہیں اُسے بدلنے کی سعی کریں اور جس نظام کے برحق اور واحد ذریعۂ فلاح و نجات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اُسے عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔

اس مختصر گذارش سے آپ یہ بات پا گئے ہونگے کہ ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے اور انہی اصولوں پر چلتا رہے مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے، یا انگریز نہ چلائے ہندوستانی چلائے، یا ہندو نہ چلائے "مسلمان" چلائے۔ ہمارے نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سور تو بہرحال سور ہی ہے اور اپنی ذات میں ناپاک ہے، خواہ اسے کافر باورچی پکائے یا مسلمان باورچی۔ بلکہ مسلمان باورچی کا سور پکانا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے اور گمراہ کن بھی۔ بہت سے بندگانِ خدا، حتیٰ کہ اچھے خاصے پرہیزگار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا سور اس اطمینان پر کھا جائیں گے کہ یہ مسلمان نے پکایا ہے۔ اور اگر اس پخت و پز کے دوران میں چمچے کی ہر گردش پر وہ باآواز بلند بسم اللہ پڑھتا رہا ہے اور اس کے چنے ہوئے دسترخوان پر مسلمانوں کو کافر کے دسترخوان کی بہ نسبت تناول ماحضر کی زیادہ آسانیاں اور آزادیاں میسر ہوں اور محفل طعام کے گرد و پیش کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کر دئے جائیں جو عام طور پر اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں، تو اس قسم کی نمائشی باتیں اس حرام خوراک کو قبول کر لینے کے لئے کوئی سفارش نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ یہ ظاہر فریبیاں اس معاملہ کو اور بھی زیادہ پر خطر بنا دیتی ہیں لہٰذا ہم کسی ایسی ظاہری تبدیلی پر نہ خود مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کو مطمئن ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ فاسد نظام تو جوں کا توں قائم رہے اور صرف اس کے چلانے والے ہاتھ بدل جائیں۔ ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے۔ وہ اصول اگر فاسد ہوں تو ہم ان کے خلاف

جنگ جاری رکھینگے اور انہیں صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو ہے ہمارا مدّعا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بھی واضح طور پر سمجھ لیں کہ موجودہ تہذیب کے وہ اصول کیا ہیں جن کو ہم مٹانا چاہتے ہیں اور ان کے جواب میں وہ دوسرے اصول کون سے ہیں جن کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ تہذیب جس پر آج دنیا کا پورا فکری، اخلاقی، تمدنی، سیاسی اور معاشی نظام چل رہا ہے دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے:-

(۱) Secularism یعنی لادینی یا دنیاویت

(۲) Nationalism یعنی قوم پرستی

(۳) Democracy یعنی حاکمیتِ جمہور

ان میں سے پہلے اصول، یعنی لادینی کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ہدایت اور اس کی عبادت کے معاملہ کو ایک ایک شخص کی ذاتی حیثیت تک محدود کر دیا جائے اور انفرادی زندگی کے اس چھوٹے سے دائرے کے سوا دنیا کے سارے معاملات کو ہم خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اپنی صوابدید کے مطابق خود جس طرح چاہیں طے کریں۔ ان معاملات میں یہ سوال خارج از بحث ہونا چاہیے کہ خدا کیا کہتا ہے اور اس کی ہدایت کیا ہے اور اس کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ ابتداءً یہ طرزِ عمل اہل مغرب نے عیسائی پادریوں کی اُس خودساختہ دینیات (Theology) سے بیزار ہو کر اختیار کیا تھا جو ان کے لئے زنجیر پا بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی طرزِ عمل ایک مستقل نظریۂ حیات بن گیا اور تہذیب جدید کا پہلا سنگ بنیاد قرار پایا۔ آپ نے اکثر یہ فقرہ سنا ہوگا کہ "مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے خدا اور بندے کے درمیان"۔ یہ مختصر سا فقرہ دراصل تہذیب حاضر کا "کلمہ" ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ اگر کسی کا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی پرستش کرنی چاہیے تو وہ اپنی انفرادی زندگی میں بخوشی اپنے خدا کو پوجے، مگر دنیا اور اس کے معاملات سے خدا اور مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ اس "کلمہ" کی بنیاد پر جس نظامِ زندگی کی عمارت اٹھی

ہے اس میں انسان اور انسان کے تعلق اور انسان اور دنیا کے تعلق کی تمام صورتیں خدا اور مذہب سے آزاد ہیں۔ معاشرت ہے تو اس سے آزاد، تعلیم ہے تو اس سے آزاد، معاشی کاروبار ہے تو اس سے آزاد، قانون ہے تو اس سے آزاد، پارلیمنٹ ہے تو اس سے آزاد، سیاست اور انتظام ملکی ہے تو اس سے آزاد، بین الاقوامی ربط وضبط ہے تو اس سے آزاد۔ زندگی کے ان بیشمار مختلف پہلوؤں میں جو کچھ بھی طے کیا جاتا ہے اپنی خواہش اور دانست کے مطابق طے کیا جاتا ہے اور اس سوال کو نہ صرف ناقابل لحاظ، بلکہ اصولاً غلط اور انتہائی تاریک خیالی سمجھا جاتا ہے کہ ان امور کے متعلق خدا نے بھی کچھ اصول اور احکام ہمارے لئے مقرر کئے ہیں یا نہیں۔ رہی انفرادی زندگی تو وہ بھی لادینی تعلیم اور بے دین اجتماعیت کی بدولت اکثر و بیشتر افراد کے معاملہ میں نری دنیاوی (Secular) ہی ہو کر رہ گئی ہے اور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب بہت ہی کم افراد کا ضمیر واقعی یہ گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی بندگی کرنی چاہیئے۔ خصوصاً جو لوگ اس وقت تمدن کے اصلی کارفرما اور کارکن ہیں ان کے لئے تو مذہب اب ایک پرائیویٹ معاملہ بھی نہیں رہا ہے۔ ان کا ذاتی تعلق بھی خدا سے ٹوٹ چکا ہے۔

دوسرے اصول، یعنی قوم پرستی کی ابتدا تو پوپ اور قیصر کے عالمگیر استبداد کے خلاف رجعت کے طور پر ہوئی تھی اور اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ مختلف قومیں اپنی اپنی سیاست و مصلحت کی آپ ہی مالک و مختار ہوں، کسی عالمگیر روحانی یا سیاسی اقتدار کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح نہ کھیلیں، مگر اس معصوم آغاز سے چل کر جب یہ تخیل آگے بڑھا تو رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جس جگہ سے بے دینی کی تحریک نے خدا کو بے دخل کیا تھا وہاں قومیت کو لا بٹھایا گیا۔ اب ہر قوم کیلئے بلند ترین اخلاقی قدر اس کا قومی مفاد اور اس کے قومی حوصلے (Aspirations) ہیں۔ نیکی وہ ہے جو قوم کے لئے مفید ہو، خواہ وہ جھوٹ ہو، بے ایمانی ہو، ظلم ہو، یا اور کوئی ایسا فعل ہو جو پرانے مذہب و اخلاق میں بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اور بدی وہ ہے جس سے قوم کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ خواہ وہ سچائی ہو، انصاف ہو، ادائے حق ہو، یا اور کوئی ایسی چیز ہو جسے کبھی فضائل اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا۔ افراد قوم

کی خوبی اور زندگی و بیداری کا پیمانہ یہ ہے کہ قوم کا مفاد ان سے جس قربانی کا مطالبہ بھی کرے، خواہ وہ جان و مال اور وقت کی قربانی ہو یا اخلاق و انسانیت اور شرافت نفس کی، بہرحال وہ اس میں دریغ نہ کریں اور متحد و منظم ہو کر قوم کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو پورا کرنے میں لگے رہیں۔ اجتماعی کوششوں کی غایت اب یہ ہے کہ ہر قوم ایسے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد بہم پہنچائے، اور ان میں ایکا اور نظم پیدا کرے تاکہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی قوم کا جھنڈا بلند کریں۔

تیسرے اصول، یعنی جمہور کی حاکمیت (Sovereignty of the People) کو ابتداءً بادشاہوں اور جاگیرداروں کے اقتدار کی گرفت توڑنے کے لئے پیش کیا گیا تھا، اور اس حد تک بات درست تھی کہ ایک شخص، یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کو لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کر دینے اور اپنی اغراض کے لئے انہیں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اس منفی پہلو کے ساتھ اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ ایک ایک ملک اور ایک ایک علاقے کے باشندے اپنے آپ حاکم اور اپنے آپ مالک ہیں۔ اسی مثبت پہلو پر ترقی کر کے جمہوریت نے اب جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم اپنی مرضی کی مختار کل ہے۔ اس کی مجموعی خواہش (یا عملاً اس کی اکثریت کی خواہش) کو پابند کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اخلاق ہو یا تمدن، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز کے لئے برحق اصول وہ ہیں جو قومی خواہش سے طے ہوں، اور جن اصولوں کو قوم کی رائے عام رد کر دے وہ باطل ہیں۔ قانون قوم کی مرضی پر منحصر ہے جو قانون چاہے بنائے اور جس قانون کو چاہے توڑ دے یا بدل دے۔ حکومت قوم کی رضا کے مطابق بننی چاہئیے، قوم ہی کی رضا کا اسے پابند ہونا چاہئیے، اور اس کی پوری طاقت قومی خواہش کو پورا کرنے پر صرف ہونی چاہئیے۔

یہ تین اصول، جن کی تشریح میں نے مختصراً آپ کے سامنے بیان کی ہے، موجودہ دور کے نظامِ زندگی کی بنیاد ہیں، اور انہی اصولوں پر وہ بے دین جمہوری قومی ریاست (Secular Democratic National State) بنتی ہے جسے آج کل اجتماعی تنظیم کی مہذب ترین معیاری صورت سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں اصول غلط ہیں۔ صرف غلط ہی نہیں، ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہی اصول ان تمام مصائب کی جڑ ہیں جن میں آج انسانیت مبتلا ہے۔ ہماری عداوت دراصل ان ہی

اصولوں سے ہے اور ہم اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان اصولوں کیا اعتراض ہے اور کیوں اعتراض ہے؟ اس کی تفصیل کے لئے تو بڑی لمبی بحث درکار ہے، مگر میں نے چند الفاظ میں آپ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرونگا تاکہ آپ ہماری اس لڑائی کی اہمیت اچھی طرح سمجھ سکیں اور آپ کو اندازہ ہو کہ کیوں یہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ ان اصولوں کے خلاف جنگ کرنا ناگزیر ہے۔

سب سے پہلے اس لادینی یا دنیاویت کو لیجئے جو اس نظامِ زندگی کا اولین سنگ بنیاد ہے۔ یہ نظریہ کہ خدا اور مذہب کا تعلق صرف آدمی کی انفرادی زندگی سے ہے، سراسر ایک مہمل نظریہ ہے جسے عقل و خرد سے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ خدا اور انسان کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو خدا انسان کا اور اس ساری کائنات کا جس میں انسان رہتا ہے، خالق اور مالک اور حاکم ہے، یا نہیں ہے۔ اگر وہ نہ خالق ہے نہ مالک اور نہ حاکم تب تو اس کے ساتھ پرائیویٹ تعلق کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ نہایت لغو بات ہے کہ ایک ایسی غیر متعلق ہستی کی خواہ مخواہ پرستش کی جائے جس کا ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر وہ فی الواقع ہمارا اور اس تمام جہانِ ہست و بود کا خالق، مالک اور حاکم ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عملداری (Jurisdiction) محض ایک ایک شخص کی پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو اور جہاں سے ایک اور ایک دو آدمیوں کا اجتماعی تعلق شروع ہوتا ہے وہیں سے اس کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہ حدبندی اگر خدا نے خود کی ہے تو اس کی کوئی سند ہونی چاہیئے، اور اگر اپنی اجتماعی زندگی میں انسان نے خدا سے بے نیاز ہو کر خود ہی خود مختاری اختیار کی ہے تو یہ اپنے خالق اور مالک اور حاکم سے اس کی کھلی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کے ساتھ یہ دعویٰ کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں خدا کو اور اس کے دین کو مانتے ہیں صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس سے زیادہ لغو بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایک شخص فرداً فرداً تو خدا کا بندہ ہو، مگر یہ الگ الگ بندے جب مل کر ایک معاشرہ بنائیں تو بندے نہ رہیں۔ اجزاء میں سے ہر ایک بندہ اور ان اجزاء کا مجموعہ غیر بندہ، یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تصور صرف ایک پاگل ہی کر سکتا ہے۔ پھر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہمیں خدا کی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت نہ اپنی خانگی معاشرت میں ہے، نہ محلے اور شہر میں،

نہ مدرسے اور کالج میں، نہ منڈی اور بازار میں، نہ پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہاؤس میں، نہ ہائی کورٹ اور سکرٹریٹ میں، نہ چھاؤنی اور پولیس لائن میں اور نہ میدان جنگ اور صلح کانفرنس میں، تو آخر اس کی ضرورت ہے کہاں؟ کیوں ایسے خدا کو مانا جائے اور اس کی خواہ مخواہ پوجا پاٹ کی جائے جو یا تو اتنا بیکار ہے کہ زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ہماری رہنمائی نہیں کرتا، یا معاذ اللہ ایسا نادان ہے کہ کسی معاملے میں بھی اس کی کوئی ہدایت ہمیں معقول اور قابل عمل نظر نہیں آتی؟

یہ تو محض اس معاملہ کا نقلی پہلو ہے۔ عملی پہلو سے دیکھئے تو اس کے نتائج بڑے ہی خطرناک ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے جس معاملے کا تعلق بھی خدا سے ٹوٹتا ہے اس کا تعلق شیطان سے جڑ جاتا ہے۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی درحقیقت کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے اور اس کی پوری زندگی اصل میں اجتماعی زندگی ہے۔ وہ پیدا ہی ایک ماں اور ایک باپ کے معاشرتی تعلق سے ہوتا ہے۔ دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت وسیاست سے واسطہ پیش آتا ہے۔ یہ بے شمار روابط جو اس کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں، انہی کی درستی پر ایک ایک انسان کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح وبہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسان کو ان روابط کے لئے صحیح اور منصفانہ اور پائیدار اصول وحدود دیتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بنا، پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف اور راستی۔ اس لئے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد پھر خواہش اور ناقص علم وتجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لئے رجوع کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینی یا دنیاویت کے اصول پر چلتا ہے اس میں خواہشات کی بنا پر روز اصول بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، بے انصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی گھس گئی ہے۔ تمام انسانی معاملات پر انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خود غرضیاں مسلط ہو گئی ہیں۔ دو انسانوں کے تعلق سے

لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہا ہے جس میں ٹیڑھ نہ آگئی ہو۔ ہر ایک شخص نے، ہر ایک گروہ نے، ہر ایک طبقے نے، ہر ایک قوم اور ملک نے اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں، جہاں تک بھی اس کا بس چلا ہے، پوری خود غرضی کے ساتھ اپنے مطلب کے اصول اور قاعدے اور قانون بنا لیے ہیں، اور کوئی بھی اس کی پروا نہیں کرتا کہ دوسرے اشخاص، گروہوں، طبقوں اور قوموں پر اس کا کیا اثر پڑیگا۔ پرواہ کرانے والی صرف ایک ہی طاقت رہ گئی ہے اور وہ ہے جوتا۔ جہاں مقابلہ میں جوتا یا جوتے کا اندیشہ ہوتا ہے صرف وہیں اپنی حد سے زیادہ پھیلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کچھ سکڑ جاتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ جوتا کسی عالم اور منصف ہستی کا نام نہیں ہے۔ وہ تو ایک اندھی طاقت کا نام ہے۔ اس لیے اس کے زور سے کبھی توازن قائم نہیں ہوتا۔ جس کا جوتا زبردست ہوتا ہے وہ دوسروں کو صرف اتنا ہی نہیں سکیڑتا جتنا اُسے سکڑنا چاہیے بلکہ وہ خود اپنی حد سے زیادہ پھیلنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ بس لادینی اور دنیاویت کا ماحصل صرف یہ ہے کہ جو بھی اس طرزِ عمل کو اختیار کریگا بے لگام، غیر ذمہ دار اور بندۂ نفس ہو کر رہیگا، خواہ وہ ایک شخص ہو یا ایک گروہ یا ایک ملک اور قوم، یا مجموعۂ اقوام۔

اب دوسرے اصول کو لیجیے۔ قوم پرستی کی تشریح ابھی تھوڑی دیر پہلے میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں وہ اگر آپ کے ذہن میں تازہ ہے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی لعنت ہے جو اس دور میں انسانیت پر مسلط ہوئی ہے۔ ہمارا اعتراض قومیت (Nationality) پر نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک فطری حقیقت ہے۔ ہم قومی خیر خواہی کے بھی مخالف نہیں ہیں بشرطیکہ اس کے اندر دوسری قوموں کی بدخواہی شامل نہ ہو۔ ہمیں قومی محبت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ وہ قومی تعصب اور اپنی قوم کی بیجا پاسداری اور دوسروں سے نفرت کی حد تک نہ جا پہنچے۔ ہم قومی آزادی کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ اپنے معاملات کو خود انجام دینا اور اپنے گھر کا آپ انتظام کرنا ہر قوم کا حق ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت درست نہیں ہے۔ دراصل جو چیز قابلِ اعتراض بلکہ قابلِ نفرت ہے وہ قوم پرستی (Nationalism) ہے۔ اس قوم پرستی کی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ قومی خود غرضی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ایک سوسائٹی کے اندر اُس شخص کا وجود ایک لعنت ہے جو

اپنے نفس اور اپنی غرض کا بندہ ہو اور اپنے مفاد کے لئے سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہو، اگر ایک بستی کے اندر وہ خاندان ایک لعنت ہے جس کے افراد اپنے خاندانی مفاد کے اندھے پرستار ہوں اور جائز و ناجائز تمام ذرائع سے بس اپنا بھلا کرنے پر تلے ہوئے ہوں، اگر ایک ملک کے اندر وہ طبقہ ایک لعنت ہے جو اپنی طبقاتی خود غرضی میں اندھا ہو رہا ہو اور دوسروں کے بھلے بُرے کی پروا کئے بغیر صرف اپنے فائدے کے پیچھے پڑ جائے (مثلاً بلیک مارکٹنگ کرنے والے)، تو آخر انسانیت کے وسیع دائرے میں وہ خود غرض قوم ایک لعنت کیوں نہیں ہے جو اپنے قومی مفاد کو اپنا خدا بنالے اور اس کی پرستش کا یہ اصول مقرر کر لے کہ حق وہ ہے جو قومی اغراض کے مطابق ہو اور باطل وہ جو اُن کے مطابق نہ ہو۔ آپ کا ضمیر گواہی دیگا کہ تمام خود غرضیوں اور نفسانیتوں کی طرح یہ قومی خود غرضی و نفسانیت بھی یقیناً ایک لعنت ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج اس تہذیب جدید نے تمام قوموں کو اسی لعنت میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کی بدولت ساری دنیا ایسے قومی اکھاڑوں میں تبدیل ہوگئی ہے جن میں سے ہر اکھاڑے کی دوسرے اکھاڑے سے لاگ ڈانٹ ہے اور دو عالمگیر دنگل ہو چکنے کے بعد ابھی پسینہ بھی خشک نہیں ہوا ہے کہ تیسرے دنگل کے لئے ڈنٹر خم تازہ کئے جارہے ہیں۔

تیسرا اصول پہلے دونوں اصولوں کے ساتھ مل کر اس بلا کی تکمیل کر دیتا ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنی ہیں جمہور کی حاکمیت یعنی ایک علاقے کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقے میں مختارِ مطلق ہونا، اور اُن کا قانون کے تابع نہ ہونا بلکہ قانون کا ان کی خواہش کے تابع ہونا، اور حکومت کی غرض صرف یہ ہونا کہ اس کا نظم اور اس کی طاقت لوگوں کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرنے کے کام آئے۔ اب غور کیجئے کہ پہلے تو لادینی نے اِن لوگوں کو خدا کے خوف اور اخلاق کے مستقل اُصولوں کی گرفت سے آزاد کر کے بے لگام اور غیر ذمہ دار اور بندۂ نفس بنا دیا، پھر قوم پرستی نے ان کو شدید قسم کی قومی خود غرضی اور اندھی عصبیت اور قومی غرور کے نشہ سے بدمست کر دیا، اور اب یہ جمہوریت انہی بے لگام بدمست بندگانِ نفس کی خواہشات کو قانون سازی کے مکمل اختیارات دیتی ہے، اور حکومت کا واحد مقصد یہ قرار دیتی ہے کہ اس کی طاقت ہر اس چیز کے حصول میں صرف ہو جس کی یہ اجتماعی

طور پر خواہش کریں سوال یہ ہے کہ اس طرح کی خود مختار صاحبِ حاکمیت قوم کا حال آخر ایک طاقت ور
اور آزاد بدمعاش کے حال سے کس بات میں مختلف ہے ؟ جو کچھ ایک بدمعاش فرد خود مختار اور
طاقت ور ہو کر چھوٹے پیمانے پر کرے گا وہی سب اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اس طرح کی ایک قوم کرے گی۔
پھر جب دنیا میں صرف ایک ہی قوم ایسی نہ ہو بلکہ ساری متمدن قومیں اسی ڈھنگ پہ بنی ہوں، قوم پرستی
اور جمہوریت کے اصولوں پر منظم ہوں تو دنیا بھیڑیوں کا میدانِ جنگ نہ بنے گی تو اور کیا بنے گی ؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم اس نظام اجتماعی کو فاسد سمجھتے ہیں جو ان تین اصولوں کی بنیاد پر بنے۔
ہماری دشمنی لادینی قومی جمہوری نظام سے ہے خواہ اس کے قائم کرنے اور چلانے والے مغربی
ہوں یا مشرقی، غیر مسلم ہوں یا نام نہاد مسلمان۔ جہاں جس ملک اور جس قوم پر بھی یہ بلا مسلط ہوگی، ہم
بندگانِ خدا کو اس سے ہوشیار کرنے کی فکر کریں گے اور انہیں دعوت دیں گے کہ اسے دفع کرو۔

اِن تین اصولوں کے جواب میں ہم دوسرے تین اصول پیش کرتے ہیں، اور سب انسانوں کے
ضمیر سے اپیل کرتے ہیں کہ انہیں جانچ کر، پرکھ کر خود دیکھ لو کہ تمہارا اپنا بھلا اور ساری دنیا کا بھلا
اِن پاک اصولوں میں ہے یا اُن خبیث اصولوں میں ؟

لادینی کے مقابلہ میں خدا کی بندگی و اطاعت،

قوم پرستی کے مقابلہ میں انسانیت،

جمہور کی حاکمیت کے مقابلہ میں خدا کی حاکمیت اور جمہور کی خلافت۔

پہلے اصول کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اُس خدا کو اپنا آقا تسلیم کریں جو ہمارا اور تمام کائنات کا
خالق، مالک اور حاکم ہے۔ ہم اس سے آزاد اور بے نیاز بن کر نہیں بلکہ اس کے تابع فرمان اور اس
کی رہنمائی کے پیرو بن کر زندگی بسر کریں۔ ہم صرف اس کی پوجا ہی نہ کریں بلکہ اس کی اطاعت
اور بندگی بھی کریں۔ ہم صرف فرداً فرداً اپنی پرائیویٹ حیثیت ہی میں اس کے احکام اور ہدایات
کے پابند نہ ہوں بلکہ اپنی اجتماعی زندگی کے بھی ہر پہلو میں اسی کے پابند ہوں۔ ہماری معاشرت،
ہمارا تمدن، ہماری معیشت، ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت، ہمارے قوانین، ہماری عدالتیں، ہماری حکومت،

ہماری صلح و جنگ اور ہمارے بین الاقوامی تعلقات، سب کے سب اُن ضابطوں اور حدوں کے پابند ہوں جو خدا نے مقرر کئے ہیں۔ ہم اپنے دنیوی معاملات کو طے کرنے میں بالکل آزاد نہ ہوں بلکہ ہماری آزادی اُن سرحدوں کے اندر محدود ہو جو خدا کے مقرر کئے ہوئے اصول اور حدود نے کھینچ دی ہیں۔ یہ اصول اور حدود ہر حال میں ہمارے اختیارات سے بالاتر ہیں۔

دوسرے اصول کا مطلب یہ ہے کہ خدا پرستی کی بنیاد پر جو نظامِ زندگی بنے اس میں قوم، نسل، وطن، رنگ اور زبان کے فرق و امتیاز کی بنا پر کسی قسم کے تعصبات اور خود غرضیاں راہ نہ پائیں۔ وہ ایک قومی نظام کے بجائے ایک اصولی نظام ہونا چاہیے جس کے دروازے ہر اس انسان کے لئے کھلے ہوئے ہوں جو اس کے بنیادی اصولوں کو مان لے، اور جو انسان بھی ان کو مان جائے وہ بغیر کسی امتیاز کے پورے مساویانہ حقوق کے ساتھ اس میں شریک ہو سکے۔ اس نظام میں شہریت (Citizenship) محض ایک ریاست کے جغرافی حدود تک محدود نہ ہو۔ بلکہ اصولی بنیادوں پر عام ہو۔ جو لوگ ان اصولوں پر مطمئن نہ ہوں یا کسی وجہ سے ان کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، ان کو مٹانے اور دبانے اور ہضم کرنے کی کوشش نہ ہو بلکہ وہ متعین حقوق کے ساتھ اس نظام کی حفاظت (Protection) میں رہیں اور اُن کے لئے ہر وقت یہ موقع کھلا رہے کہ جب بھی ان اصولوں کی صحت و درستی پر ان کا اطمینان ہو جائے وہ برابر کے حقوق کے ساتھ اپنی آزادانہ مرضی سے اس نظام کے کارفرما بن سکیں۔ یہ چیز جس کو ہم اصولِ انسانیت سے تعبیر کر رہے ہیں، قومیت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اسے اس کی صحیح فطری حدیں رکھتی ہے۔ اس میں قومی محبت کے لئے جگہ ہے، مگر قومی تعصب کے لئے جگہ نہیں ہے۔ قومی خیر خواہی جائز ہے مگر قومی خود غرضی حرام ہے۔ قومی آزادی مسلّم ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کے خود غرضانہ تسلط سے بھی سخت انکار ہے، مگر ایسی قومی آزادی ہرگز تسلیم نہیں ہے جو انسانیت کو ناقابلِ عبور سرحدوں میں تقسیم کر دے۔ اصولِ انسانیت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر قوم اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور کوئی قوم من حیث القوم دوسری قوم کی تابع نہ ہو، لیکن تمام وہ قومیں جو تہذیبِ انسانی کے بنیادی اصولوں میں متفق ہو جائیں، اُن کے درمیان انسانی

فلاح و ترقی کے کاموں میں پورا تعاون ہو، مسابقت (Competition) کے بجائے معاونت ہو، باہم امتیازات اور تعصبات اور تفریقیں نہ ہوں، تہذیب و تمدن اور اسباب زندگی کا آزادانہ لین دین ہو، اور اس مہذب نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کرنے والی دنیا کا ہر انسان اس پوری دنیا کا شہری ہو نہ کہ ایک ملک اور ایک قوم کا، حتیٰ کہ وہ کہہ سکے کہ "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست"۔ موجودہ حالت کو ہم ایک قابل نفرت حالت سمجھتے ہیں جس میں ایک انسان نہ تو خود ہی اپنی قوم اور ملک کے سوا کسی دوسری قوم اور ملک کا وفادار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم اپنے افراد کے سوا دوسری کسی قوم کے افراد پر اعتماد کر سکتی ہے۔ آدمی اپنے ملک کے حدود سے باہر نکلتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کی زمین میں ہر جگہ اس کے لئے رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں۔ ہر جگہ وہ چوروں اور اچکوں کی طرح شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہے تلاشیاں ہیں، زبان و قلم اور نقل و حرکت پر پابندیاں ہیں، اور کہیں اس کے لئے نہ آزادی ہے نہ حقوق۔ ہم اس کے مقابلہ میں ایسا عالمگیر نظام چاہتے ہیں جس میں اصولوں کی وحدت کو بنیاد بنا کر قوموں کے درمیان وفاق قائم ہو اور اس وفاق میں بالکل مساویانہ اور مشترک شہریت (Common Citizenship) اور قطعاً بے روک ٹوک آمد و رفت کا طریقہ رائج ہو۔ ہماری آنکھیں پھر ایک دفعہ یہ منظر دیکھنا چاہتی ہیں کہ آج کا کوئی ابن بطوطہ اٹلانٹک کے ساحل سے بحر الکاہل کے ساحل تک اس طرح جائے کہ کہیں وہ غیر (Alien) نہ ہو اور ہر جگہ اس کے لئے جج، مجسٹریٹ، وزیر یا سفیر بن جانے کا موقع ہو۔

اب تیسرے اصول کو لیجئے۔ ہم جمہوری حاکمیت کے بجائے جمہوری خلافت کے قائل ہیں۔ شخصی بادشاہی (Monarchy) اور امیروں کے اقتدار اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنا موجودہ زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہو سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے کسی بڑے سے بڑے حامی کو ہو سکتا ہے۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکمرانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے سے ہونا

چاہیئے۔ ہم بھی اُس نظام زندگی کے سخت مخالف ہیں جس میں لوگوں کے لئے اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی اور سعی و عمل کی آزادی نہ ہو، یا جس میں پیدائش اور نسل اور طبقات کی بنا پر بعض لوگوں کے لئے مخصوص حقوق اور بعض دوسرے لوگوں کے لئے مخصوص رکاوٹیں ہوں۔ یہ اُمور جو جمہوریت کا اصل جوہر (Essence) ہیں، ان میں ہماری جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اہل مغرب نے ہمیں سکھائی ہو۔ ہم اس جمہوریت کو اس وقت سے جانتے ہیں اور دنیا کو اس کا بہترین عملی نمونہ دکھا چکے ہیں جبکہ مغربی جمہوریت پرستوں کی پیدائش میں ابھی سینکڑوں برس کی دیر تھی۔ دراصل ہمیں اس نوخیز جمہوریت سے جس چیز میں اختلاف اور نہایت سخت اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ وہ جمہور کی مطلق العنان بادشاہی کا اصول پیش کرتی ہے اور ہم اس کو حقیقت کے اعتبار سے غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہی (Sovereignty) صرف اس کا حق ہے جس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، جو اُن کی پرورش اور بالیدگی کا سامان کر رہا ہے، جس کے سہارے پر اُن کی اور ساری دُنیا کی ہستی قائم ہے اور جس کے زبردست قانون کی گرفت میں کائنات کی ایک ایک چیز جکڑی ہوئی ہے۔ اس کی واقعی اور حقیقی بادشاہی کے اندر جس بادشاہی کا بھی دعویٰ کیا جائے گا، خواہ وہ ایک شخص اور ایک خاندان کی بادشاہی ہو یا ایک قوم اور اس کے عوام کی، بہرحال وہ ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اس غلط فہمی کی چوٹ اصل بادشاہ پر نہیں بلکہ اُس احمق مدعی پر ہی پڑے گی جس نے اپنی قدر خود نہ پہچانی۔ اس حقیقت کی موجودگی میں صحیح بھی یہی ہے اور نتائج کے اعتبار سے انسان کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ خدا کو حاکم مان کر انسانی زندگی کا نظامِ حکومت خلافت و نیابت کے نظریہ پر بنایا جائے۔ یہ خلافت بلاشبہ جمہوری ہونی چاہیئے۔ جمہور کی رائے ہی سے حکومت کے امیر یا ناظمِ اعلیٰ کا انتخاب ہونا چاہیئے، انہی کی رائے سے اہل شوریٰ منتخب ہونے چاہئیں، انہی کے مشورے سے حکومت کے سارے انتظامات چلنے چاہئیں، اور ان کو تنقید و احتساب کا کھلا حق ہونا چاہیئے، لیکن یہ سب کچھ اس احساس و شعور کے ساتھ ہونا چاہیئے کہ ملک خدا کا ہے، ہم مالک نہیں بلکہ نائب ہیں، اور ہمیں اپنے ہر کام کا حساب اصل مالک کو دینا ہے نیز وہ اخلاقی اصول اور قانونی احکام اور حدود اپنی جگہ اٹل ہونے چاہئیں جو

خدا نے ہماری زندگی کے لئے مقرر کردئے ہیں۔ ہماری پارلیمنٹ کا اساسی نظریہ یہ ہونا چاہیئے کہ جن امور میں خدا نے ہمیں ہدایات دی ہیں ان میں ہم قانون سازی نہیں کریں گے بلکہ اپنی ضروریات کے لئے خدا کی ہدایات سے تفصیلی قوانین اخذ کریں گے، اور جن امور میں خدا نے ہدایات نہیں دی ہیں ان میں ہم یہ سمجھیں گے کہ خدا نے خود ہی ہم کو آزادی عمل بخشی ہے اس لئے صرف انہی امور میں ہم باہمی مشورے سے قوانین بنائیں گے، مگر یہ قوانین لازماً اس مجموعی سانچے کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے ہونگے جو خدا کی اصولی ہدایات نے ہمارے لئے بنا دیا ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ اس پورے نظام تمدن وسیاست کی کارفرمائی اور اس کا انتظام ان لوگوں کے سپرد ہو جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے اور ہر کام میں اس کی رضا چاہنے والے ہوں، جن کی زندگی گواہ ہو کہ وہ خدا کے حضور اپنی پیشی اور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں، جن کی پبلک اور پرائیویٹ دونوں قسم کی زندگیوں سے یہ شہادت ملے کہ وہ بے لگام گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جو ہر کھیت میں چرتا اور ہر حد کو پھاندتا پھرتا ہو، بلکہ ایک الٰہی ضابطہ کی رسی سے بندھے ہوئے اور ایک خدا پرستی کے کھونٹے سے مربوط ہیں اور ان کی ساری حرکت پھرت اسی حد تک محدود ہے جہاں تک وہ رسی انہیں جانے دیتی ہے۔

حضرات! یہ تینوں اصول جن کی بہت ہی مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، موجودہ تہذیب کی قوم پرستانہ لادینی جمہوری حاکمیت کے مقابلہ میں ایک خدا پرستانہ انسانی جمہوری خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کا قیام ہمارا نصب العین ہے۔ یہ بات تو آپ بیک نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان کھلا اختلاف ہے۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اپنے ضمیر پر منحصر ہے کہ ان میں سے کون بہتر ہے، کس میں آپ کی فلاح ہے، کس کے قیام کا آپ کو خواہشمند ہونا چاہیئے اور کس کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں آپ کی قوتیں صرف ہونی چاہئیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان سے تو میں صاف کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی لادینی قومی جمہوریت تمہارے دین وایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ تم اس کے آگے سر تسلیم خم کرو گے تو قرآن سے پیٹھ پھیرو گے۔ اس کے قیام وبقا میں حصہ لو گے تو اپنے رسول سے غداری کرو گے۔ اور اس کا جھنڈا اٹھانے کے لئے

اٹھو گے تو اپنے خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرو گے۔ جس اسلام کے نام پر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو اُس کی روح اِس ناپاک نظام کی روح سے، اس کے بنیادی اصول اس کے بنیادی اصولوں سے اور اُس کا ہر جزو اِس کے ہر جزو سے برسر جنگ ہے۔ اسلام اور یہ نظام ایک دوسرے سے کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ نظام برسر اقتدار ہوگا وہاں اسلام نقش برآب رہیگا اور جہاں اسلام برسر اقتدار ہوگا وہاں اس نظام کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم اگر واقعی اُسی اسلام پر ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادینی جمہوریت کی مزاحمت کرو اور اس کے مقابلہ میں خدا پرستانہ انسانی خلافت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرو خصوصیت کے ساتھ جہاں تم بحیثیت ایک قوم کے برسر اقتدار ہو وہاں تو اگر تمہارے اپنے ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے بجائے یہ کافرانہ نظام بنے اور چلے تو حیف ہے تمہاری اس جھوٹی مسلمانی پر جس کا نام لینے میں تم اتنے بلند آہنگ اور جس کا کام کرنے میں تم اتنے جی چور ہو۔

اس سلسلہ میں جملہ معترضہ کے طور پر اپنے مسلمان بھائیوں سے مجھے ایک بات اور بھی کہنی ہے بعض مذہبی جامہ پہننے والے لوگ آپ کو اس غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں اور شاید خود بھی اس دھوکے میں ہیں کہ "حکومت تو ایک انعام ہے جو نمازیں پڑھنے اور نیکیاں کرنے کے صلے میں خدا کی طرف سے ملا کرتا ہے، اس کے حصول کی کوشش محض دنیا پرستی اور اس کو نصب العین بنانا خلاف اسلام ہے"۔ یہ باتیں جو لوگ کرتے ہیں انہوں نے اس معاملہ کو سرے سے سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی ہے، اور اگر وہ بُرا نہ مانیں تو میں کہونگا کہ وہ سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں، کیونکہ اس طرح وہ عیش منغص ہو جائیگا جو موجودہ نظام کی فرماں روائی میں ان کو حاصل ہے یا حاصل ہونے کا لالچ ہے۔ یہ لوگ اس سارے معاملہ کو انعام کے پہلو سے دیکھ رہے ہیں اور فرض کا پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بیشک خلافت الٰہیہ کا قائم ہو جانا ایک انعام ہے، مگر اس کے قیام کی کوشش کرنا ایک فرض بھی تو ہے، تاکہ خلافت شیطانیہ کی جگہ وہ نظام حق برپا ہو جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں پروان چڑھ سکیں۔ تم فرض سے جی چراتے ہو اور انعام کی اُمید رکھتے ہو؟ یہ بوالفضولی تمہیں کو مبارک رہے!

رہے غیر مسلم حضرات، تو ان سے میری خیرخواہانہ گزارش یہ ہے کہ براہ کرم اصول کے معاملہ میں اُن تعصبات کے قفل اپنے دلوں پر نہ چڑھائیے جو پچھلی تاریخ اور آج کی قومی کشمکش کی وجہ سے ہمارے اور آپ کے درمیان پیدا ہوگئے ہیں۔ اصول کسی قوم کی آبائی جائداد نہیں ہوتے، نہ ان پر کسی قومیت کا ٹھپّا لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اگر صحیح اور مفید ہیں تو سب انسانوں کے لئے صحیح اور مفید ہیں، اور اگر غلط ہیں تو سب ہی کے لئے غلط ہیں، بلالحاظ اس کے کہ کون ان کا پیش کرنے والا ہے اور کس زبان میں انہیں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حفظانِ صحت کے اصولوں میں، طب کے اصولوں میں، تجارت اور صنعت، زراعت اور ساخت کے دوسرے فنوں میں، سائنس اور دوسرے علوم و فنون کے اصولوں میں یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ فلاں ملک، اور فلاں قوم کی چیزیں ہیں اس لئے دوسرے ان سے تعصب کریں۔ آپ جس صحیح اصول کو قبول کرنے میں بھی تعصب سے کام لیں گے اپنا ہی نقصان کریں گے۔ بالکل یہی معاملہ اخلاق، تمدن، معاشرت، تہذیب، معیشت اور سیاست کے اصولوں کا بھی ہے۔ یہ بھی درحقیقت غیر قومی اور غیر نسلی چیزیں ہیں۔ ان کو بھی ان کے اپنے حسن و قبح (Merits) ہی کے لحاظ سے قبول یا رد کرنا چاہیے۔ آپ صحیح اصول اختیار کریں گے تو اپنا بھلا کریں گے، کسی پر کوئی احسان نہ کریں گے۔ غلط اصولوں کی پیروی کریں گے تو اپنا نقصان کریں گے، کسی کا کچھ نہ بگاڑیں گے۔

آپ نے خود بھی دنیا کے دوسرے اصولوں کے معاملہ میں تعصب نہیں برتا ہے۔ یہ لادینی، یہ قوم پرستی، یہ مغربی جمہوریت آپ کے پاس اُن انگریزوں ہی کے ذریعہ سے تو آئی ہے جو دو سو برس آپ پر ظالمانہ حکومت کرتے رہے اور جن کے خلاف چالیس پچاس سال آپ آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ پھر اُن دشمنوں کے لائے ہوئے اصولوں کو قبول کرنے میں آپ نے کیوں تعصب سے کام نہ لیا؟ یہ سوشلزم اور کمیونزم جن کی طرف آپ میں سے بہت سے لوگ لپک رہے ہیں، جرمنی کے ایک یہودی دماغ سے نکلے اور روس میں پروان چڑھے۔ ان قوموں سے آخر آپ کا کیا رشتہ ہے؟ پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں نہ سمجھا؟ اگر ان کے معاملہ میں آپ تعصب کو بالائے طاق رکھ سکتے ہیں اور اصول کو اصول ہی کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جو اصول ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان پر غور کرنے میں یہ خیال آپ کی نظر کو

کو الجھا دے کہ ان کے پیش کرنے والے لوگ ایک ایسی قوم کے افراد ہیں جس سے آپ کچھ تاریخی شکایات رکھتے ہیں یا جس کے ساتھ آج آپ کی لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔

ہم دلائل کے ساتھ اُن غلط اصولوں پر تنقید کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک انسانیت کے لئے تباہ کن ہیں اور اُن کے جواب میں وہ اصول پیش کر رہے ہیں جن کے اندر ہمیں اپنی، آپ کی، اور سب انسانوں کی فلاح نظر آتی ہے۔ آپ کھلے دل سے دیکھئے کہ آپ کا اپنا بھلا فی الواقع کن اصولوں کی پیروی میں ہے۔ خود جانچ کر دیکھ لیجئے کہ خدا پرستی بہتر ہے یا بے دینی، قوم پرستی بہتر ہے یا انسانیت، تہذیبی مطلق العنانی بہتر ہے یا خدا کی بادشاہی کے تحت جمہوری خلافت، انسانی معاملات کی باگیں خدا سے بے خوف لوگوں کے ہاتھوں میں رہنی بہتر ہیں یا ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ اگر آپ کا دل گواہی دے کہ یہ چیز جو ہم پیش کر رہے ہیں زیادہ صحیح اور نتائج کے لحاظ سے زیادہ اچھی ہے تو اسے اختیار کرکے آپ خود اپنی ہی خیر خواہی کریں گے۔

اس کے بعد صرف ایک عملی سوال حل طلب باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس خدا پرستانہ نظام کو چلانے کے لئے ہدایات کہاں سے حاصل کی جائیں؟ وہ خدائی قانون و دستور کونسا ہے جس پر ہم اپنی ریاست کی بنیاد رکھیں؟ بظاہر یہ سوال بہت پیچیدہ ہے، کیونکہ جس آسانی کے ساتھ حکومت الٰہیہ، رام راج یا Kingdom of God کے سادہ تصور پر لوگوں کے درمیان اتفاق ہو سکتا ہے اسی آسانی کے ساتھ کسی دستور و قانون کو خدائی دستور و قانون کی حیثیت سے قبول کرنے پر اتفاق نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ پیچیدگی ایسی سخت نہیں ہے کہ اس کو کسی طرح رفع کیا ہی نہ جا سکتا ہو۔

اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائیگا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائیگا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصہ میں ہم کوشش کرینگے کہ رائے عام کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلہ میں یہ خدا پرستانہ جمہوری خلافت، جو محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہو گی، کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لئے اور کہاں تک تمام دنیا کے لئے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں آپ کی اکثریت اور ہماری اقلیت ہو گی۔ وہاں ہم آپ سے عرض کریں گے کہ خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں سے وہ اصول نہ لیجئے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو بھی خراب کر رہی ہیں۔ ان کے بجائے آپ پہلے یہ تین اصول مان لیجئے جن کو ہر زمانے میں خدا کے نیک بندے لیکر آئے ہیں، جنہیں آپ کے بزرگ بھی اسی طرح پیش کرتے تھے جس طرح ہمارے بزرگوں نے پیش کیا تھا۔ پھر اپنے بزرگوں کی تعلیمات میں تلاش کیجئے کہ ان اصولوں کے مطابق ایک ریاست ــــ زمانہ حال کی ایک ترقی پذیر ریاست ــــ کا نظام چلانے کے لئے کوئی مفصل ہدایت ملتی ہے یا نہیں۔ رام چندر جی کرشن جی، بودھ مہاراج، گورونانک اور دوسرے تمام رشیوں اور منیوں کی تعلیم اور ان کی سیرتوں کا جائزہ لیجئے۔ ویدوں اور پرانوں اور شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھئے۔ اگر ان میں کوئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندوستان کی ریاست کا نظام اسی پر قائم کیجئے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجئے جو آپ کا دین ہمارے لئے تجویز کرتا ہے۔ ہم اس نظام کی مزاحمت نہیں کرینگے۔ اسے کام کرنے کا پورا موقع دیں گے اور بغیر کسی تعصب کے یہ دیکھینگے کہ آپ خدا پرستی، انسانیت اور خدا پرستانہ جمہوریت کی جو عملی تعبیر پیش کرتے ہیں وہ کہاں تک ہندوستان کے لیئے اور کہاں تک دنیا کے لئے رحمت و برکت کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ہاں ایسا کوئی مفصل ہدایت نامہ نہ پائیں، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خدا نے آپ کے ہاں بھیجا نہیں تھا، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنی طویل تاریخ کے انقلابات میں اسے یا اس کے ایک بڑے حصے کو آپ کھو بیٹھے ہیں۔ وہی چیز اسی خدا کی بھیجی ہوئی، ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اِس سے گھبرائیے نہیں، یہ آپ ہی کی کھوئی ہوئی چیز ہے جو ایک دوسرے ذریعہ سے آپ کے پاس واپس آئی ہے۔ آپ اسے پہچاننے کی کوشش کریں، اسے جانچیں، پرکھیں اور برت کر دیکھیں کہ اس میں واقعی آپ کی اور دنیا کی فلاح ہے یا نہیں۔

بناؤ اور بگاڑ

(یہ تقریر ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو دار الاسلام پٹھانکوٹ کے جلسۂ عام میں کی گئی تھی۔ سامعین میں دو ہزار مسلمانوں کے علاوہ ڈیڑھ دو سو ہندو اور سکھ اصحاب بھی شریک تھے۔ پس منظر میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب سارا مشرقی پنجاب ایک کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے لئے تیار تھا اور تین ہی مہینے بعد وہاں فتنہ و فساد کی وہ آگ بھڑکنے والی تھی جس کی تباہ کاریاں اب تاریخ انسانی کا ایک دردناک ترین باب بن چکی ہیں)

تعریف اور شکر اس خدا کے لئے ہے جس نے ہمیں پیدا کیا، عقل اور سمجھ بوجھ عطا کی، برے اور بھلے کی تمیز بخشی، اور ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنے بہترین بندوں کو بھیجا۔ اور سلام ہو خدا کے ان نیک بندوں پر جنہوں نے آدم کی اولاد کو آدمیت کی تعلیم دی، بھلے مانسوں کی طرح رہنا سکھایا، انسانی زندگی کے اصل مقصد سے انہیں آگاہ کیا اور وہ اصول ان کو بتائے جن پر چل کر وہ دنیا میں سکھ اور آخرت میں نجات پا سکتے ہیں۔

حاضرین و حاضرات! یہ دنیا جس خدا نے بنائی ہے اور جس نے اس زمین کا فرش بچھا کر اس پر انسانوں کو بسایا ہے وہ کوئی اندھا دھند اور الل ٹپ کام کرنے والا خدا نہیں ہے۔ وہ چوپٹ راجہ نہیں ہے کہ اس کی نگری اندھیر نگری ہو۔ وہ اپنے مستقل قانون، پختہ ضابطے اور مضبوط قاعدے رکھتا ہے جن کے مطابق وہ اس سارے جہان پر خدائی کر رہا ہے۔ اس کے قانون سے جس طرح سورج، چاند، زمین اور تارے بندھے ہوئے ہیں، جس طرح ہوا، پانی، درخت اور جانور بندھے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم آپ سب انسان بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا قانون جس طرح ہماری پیدائش اور موت پر، ہمارے بچپن اور جوانی اور بڑھاپے پر، ہمارے سانس کی آمد و رفت پر، ہمارے ہاضمے اور خون کی گردش پر اور ہماری بیماری اور تندرستی پر بے لاگ اور اٹل طریقے

سے چل رہا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر، ہمارے گرنے اور اُٹھنے پر، ہماری ترقی اور تنزل پر، اور ہماری ذاتی، قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے اور یہ قانون بھی اتنا ہی بے لاگ اور اٹل ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ناک سے سانس لینے کے بجائے آنکھوں سے سانس لینے لگے اور معدے میں کھانا ہضم کرنے کے بجائے دل میں ہضم کرنے لگے، تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جس راہ پر چل کر کسی قوم کو نیچے جانا چاہیے وہ اسے بلندی پر لے جائے۔ اگر آگ ایک کے لئے گرم اور دوسرے کے لئے ٹھنڈی نہیں ہے تو بُرے کرتوت بھی، جو خدا کے قانون کی رُو سے بُرے ہیں، ایک کو گرانے والے اور دوسرے کو اٹھانے والے نہیں ہو سکتے۔ جو اصول بھی خدا نے انسان کی بھلی اور بُری تقدیر بنانے کے لئے مقرر کئے ہیں وہ نہ کسی کے بدلے بدل سکتے ہیں، نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتے ہیں، اور نہ ان میں کسی کے ساتھ دشمنی اور کسی دوسرے کے ساتھ رعایت ہی پائی جاتی ہے۔

خدا کے اس قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ

وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا

مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے۔ اس کے دئے ہوئے ذرائع اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا ...... اور اس سے یہ توقع کی بھی نہیں جا سکتی کہ وہ کبھی اسے پسند کریگا ــــــ کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے، اجاڑی جائے اور اس کو بدنظمی سے، گندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، اُن میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظر انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔ پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا۔ جب تک ان کا بناؤ ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا میدان میں موجود نہیں ہوتا

اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے تمام قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انہیں ہٹا کر پھینک دیتا ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔

یہ قانون بالکل ایک فطری قانون ہے اور آپ کی عقل گواہی دیگی کہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اگر آپ میں سے کسی شخص کا کوئی باغ ہو اور وہ اسے ایک مالی کے سپرد کرے تو آپ خود بتائیے کہ وہ اس مالی سے اولین بات کیا چاہے گا؟ باغ کا مالک اپنے مالی سے اس کے سوا آخر اور کیا چاہ سکتا ہے کہ وہ اس کے باغ کو بنائے نہ کہ خراب کرکے رکھ دے۔ وہ تو لازماً یہی چاہے گا کہ اس کے باغ کو زیادہ سے زیادہ بہتر حالت میں رکھا جائے، زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے، اس کے حسن میں، اس کی صفائی میں، اس کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ جس مالی کو وہ دیکھے گا کہ وہ خوب محنت سے، جی لگا کر، سلیقے اور قابلیت کے ساتھ اس کے باغ کی خدمت کر رہا ہے، اس کی روشوں کو سنوار رہا ہے، اس کے اچھے درختوں کو پرورش کر رہا ہے، اس کو بری ذات کے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر رہا ہے، اور اس میں اپنی جدت اور جودت سے عمدہ پھلوں اور پھولوں کی نئی نئی قسموں کا اضافہ کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ وہ اس سے خوش ہو، اسے ترقی دے اور ایسے لائق، فرض شناس اور خدمت گزار مالی کو نکالنا کبھی پسند نہ کرے۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ دیکھے کہ مالی نالائق بھی ہے، کام چور بھی ہے اور جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس باغ کے ساتھ بدخواہی بھی کر رہا ہے، سارا باغ گندگیوں سے اٹا پڑا ہے، روشیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں، پانی کہیں بلا ضرورت بہ رہا ہے، اور کہیں قطعے کے قطعے سوکھتے چلے جا رہے ہیں، گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھولوں اور پھلدار درختوں کو بے دردی کے ساتھ کاٹ کاٹ کر اور توڑ توڑ کر پھینکا جا رہا ہے، اچھے درخت مرجھا رہے ہیں اور خاردار جھاڑیاں بڑھ رہی ہیں، تو آپ خود ہی سوچئے کہ باغ کا مالک ایسے مالی کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ کون سی سفارش، کونسی عرض معروض اور دست بستہ التجائیں، اور کونسے آبائی حقوق یا دوسرے خود ساختہ حقوق کا لحاظ اس کو اپنا باغ ایسے مالی کے حوالے کئے رہنے پر آمادہ کر سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ رعایت وہ بس اتنی ہی تو کرے گا کہ اسے تنبیہ کرکے پھر ایک موقع دیدے۔ مگر جو مالی تنبیہ پر بھی ہوش میں نہ آئے اور باغ کو اجاڑے ہی چلا جائے اس کا علاج

اس کے سوا اور کیا ہے کہ باغ کا مالک کان پکڑ کر اسے نکال باہر کرے اور دوسرا مالی اس کی جگہ رکھ لے۔

اب غور کیجیے کہ اپنے ایک ذرا سے باغ کے انتظام میں جب آپ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو خدا، جس نے اپنی اتنی بڑی زمین اتنے سروسامان کے ساتھ انسانوں کے حوالہ کی ہے اور اتنے وسیع اختیارات ان کو اپنی دنیا اور اس کی چیزوں پر دئے ہیں، وہ آخر اس سوال کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے کہ آپ اس کی دنیا بنا رہے ہیں یا اجاڑ رہے ہیں۔ آپ بنا رہے ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو خواہ مخواہ ہٹا دے۔ لیکن اگر آپ بنائیں کچھ نہیں اور اس کے اس عظیم الشان باغ کو بگاڑتے اور اجاڑتے ہی چلے جائیں، تو آپ نے اپنے دعوے اپنی دانست میں خواہ کیسی ہی زبردست من مانی بنیادوں پر قائم کر رکھے ہوں، وہ اپنے باغ پر آپ کے کسی حق کو تسلیم نہیں کریگا اور کچھ تنبیہات کرکے، سنبھلنے کے دو چار مواقع دیکر آخر آپ کو انتظام سے بے دخل ہی کرکے چھوڑیگا۔

اس معاملہ میں خدا کا نقطۂ نظر انسانوں کے نقطۂ نظر سے اسی طرح مختلف ہے جس طرح خود انسانوں میں ایک باغ کے مالک کا نقطۂ نظر اس کے مالی کے نقطۂ نظر سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ فرض کیجیے کہ مالیوں کا ایک خاندان دو چار پشت سے ایک شخص کے باغ میں کام کرتا چلا آرہا ہے۔ ان کا کوئی دادا پردادا اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے یہاں رکھا گیا تھا۔ پھر اس کی اولاد نے بھی کام اچھا کیا، تو مالک نے سوچا کہ خواہ مخواہ انہیں ہٹانے اور نئے آدمی رکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب کام یہ بھی اچھا ہی کر رہے ہیں تو ان کا حق دوسروں سے زیادہ ہے۔ اس طرح یہ خاندان باغ میں جم گیا۔ لیکن اب اس خاندان کے لوگ نہایت نالائق، بے سلیقہ، کام چور اور نافرض شناس اٹھے ہیں۔ باغبانی کی کوئی صلاحیت ان کے اندر نہیں ہے۔ سارے باغ کا ستیاناس کئے ڈالتے ہیں۔ اور اس پر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم باپ دادا کے وقتوں سے اس باغ میں رہتے چلے آتے ہیں، ہمارے پردادا ہی کے ہاتھوں اول اول یہ باغ آباد ہوا تھا، لہٰذا ہمارے اس پر پیدائشی حقوق ہیں، اور اب کسی طرح یہ جائز نہیں ہے کہ ہمیں بے دخل کرکے کسی دوسرے کو یہاں کا مالی بنا دیا جائے۔ یہ ان نالائق مالیوں کا نقطۂ نظر ہے۔ مگر کیا باغ کے مالک کا نقطۂ نظر بھی یہی ہو سکتا ہے؟ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ میرے نزدیک تو سب سے مقدم چیز میرے باغ کا حسن انتظام ہے۔ میں نے یہ باغ تمہارے پردادا کے لئے

نہیں لگایا تھا بلکہ تمہارے پردادا کو اس باغ کے لئے نوکر رکھا تھا۔ تمہارے اس پر جو حقوق بھی ہیں خدمت اور قابلیت کے ساتھ مشروط ہیں۔ باغ کو بناؤ گے تو تمہارے سب حقوق کا لحاظ کیا جائیگا۔ اپنے پرانے مالیوں سے آخر مجھے کیا دشمنی ہو سکتی ہے کہ وہ کام اچھا کریں تب بھی میں انہیں خواہ مخواہ نکال ہی دوں اور نئے امیدواروں کا بلا ضرورت تجربہ کروں۔ لیکن اگر اس باغ ہی کو تم بگاڑتے اور اجاڑتے رہے جس کے انتظام کی خاطر تمہیں رکھا گیا تھا تو پھر تمہارا کوئی حق مجھے تسلیم نہیں ہے۔ دوسرے امیدوار موجود ہیں، باغ کا انتظام ان کے حوالے کرونگا اور تم کو ان کے ماتحت پیش خدمت بن کر رہنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر تم درست نہ ہوئے اور ثابت ہوا کہ ماتحت کی حیثیت سے بھی تم کسی کام کے نہیں ہو، بلکہ کچھ بگاڑنے ہی والے ہو تو تمہیں یہاں سے نکال باہر کیا جائیگا اور تمہاری جگہ خدمت گار بھی دوسرے ہی لا کر بسائے جائیں گے۔

یہ فرق جو مالک اور مالیوں کے نقطۂ نظر میں ہے، ٹھیک یہی فرق دنیا کے مالک اور دنیا والوں کے نقطۂ نظر میں بھی ہے۔ دنیا کی مختلف قومیں زمین کے جس جس خطے میں بستی ہیں، ان کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ خطہ ہمارا قومی وطن ہے، پشتہا پشت سے ہم اور ہمارے باپ دادا یہاں رہتے چلے آرہے ہیں، اس ملک پر ہمارے پیدائشی حقوق ہیں، لہٰذا یہاں انتظام ہمارا اپنا ہی ہونا چاہیئے، کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ باہر سے آکر یہاں کا انتظام کرے۔ مگر زمین کے اصلی مالک، خدا کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ اس نے کبھی ان قومی حقوق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ نہیں مانتا کہ ہر ملک پر اس کے باشندوں کا پیدائشی حق ہے جس سے اس کو کسی حال میں بیدخل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قوم اپنے وطن میں کام کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ بناؤ اور سنوار کے کام کرتی ہو، اگر وہ اپنی قوتیں زمین کی اصلاح و ترقی میں استعمال کرتی ہو، اگر وہ برائیوں کی پیداوار روکنے اور بھلائیوں کی کھیتی سینچنے میں لگی ہوئی ہو، تو مالکِ کائنات کہتا ہے کہ بیشک تم اس کے مستحق ہو کہ یہاں کا انتظام تمہارے ہاتھ میں رہنے دیا جائے، تم پہلے سے یہاں آباد بھی ہو اور اہل بھی ہو، لہٰذا تمہارا ہی حق دوسروں کی بہ نسبت مقدم ہے۔ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو، بناؤ کچھ نہ ہو اور سب بگاڑ ہی کے کام ہوئے جا رہے ہوں، بھلائیاں کچھ نہ ہوں اور برائیوں ہی سے خدا کی زمین بھری جا رہی ہو، جو کچھ خدا نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے بیدردی کے ساتھ تباہ کیا جا رہا ہو اور کوئی بہتر کام اس سے لیا ہی نہ جاتا ہو، تو پھر خدا کی طرف سے

پہلے کچھ ہلکی اور کچھ سخت چوٹیں لگائی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ ہوش میں آئیں اور اپنا رویہ درست کر لیں۔ پھر جب وہ قوم اس پر بھی درست نہیں ہوتی تو اسے ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جاتا ہے اور کسی دوسری قوم کو، جو کم از کم اس کی بہ نسبت اہل تر ہو، وہاں کی حکومت دے دی جاتی ہے۔ اور بات اس پر بھی ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر ماتحت بننے کے بعد بھی باشندگانِ ملک کسی لیاقت و اہلیت کا ثبوت نہیں دیتے اور اپنے عمل سے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے کچھ بھی بن نہ آئیگا بلکہ کچھ بگڑے گا ہی، تو خدا پھر ایسی قوم کو مٹا دیتا ہے اور دوسروں کو لے آتا ہے جو اس کی جگہ بستے ہیں۔ اس معاملہ میں خدا کا نقطۂ نظر ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو مالک کا ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی زمین کے انتظام میں دعویداروں اور امیدواروں کے آبائی یا پیدائشی حقوق نہیں دیکھتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کون بناؤ کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور بگاڑ کی طرف کم سے کم میلان رکھتا ہے۔ ایک وقت کے امیدواروں میں سے جو اس لحاظ سے اہل تر نظر آتے ہیں، انتخاب انہی کا ہوتا ہے اور جب تک ان کے بگاڑ سے ان کا بناؤ زیادہ رہتا ہے، یا جب تک ان کی بہ نسبت زیادہ اچھا بنانے والا اور کم بگاڑنے والا کوئی میدان میں نہیں آ جاتا، اس وقت تک انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں، تاریخ گواہ ہے کہ خدا نے ہمیشہ اپنی زمین کا انتظام اسی اصول پر کیا ہے۔ دور کیوں جائیے، خود اپنے اسی ملک کی تاریخ دیکھ لیجئے۔ یہاں جو قومیں پہلے آباد تھیں ان کی تعمیری صلاحیتیں جب ختم ہو گئیں تو خدا نے آریوں کو یہاں کے انتظام کا موقع دیا جو اپنے وقت کی قوموں میں سب سے زیادہ اچھی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر ایک بڑے شاندار تمدن کی بنا رکھی، بہت سے علوم و فنون ایجاد کیے، زمین کے خزانوں کو نکالا اور انہیں بہتری میں استعمال کیا۔ بگاڑ سے زیادہ بناؤ کے کام کر کے دکھائے۔ یہ قابلیتیں جب تک ان میں رہیں تاریخ کے سارے نشیبوں اور فرازوں کے باوجود وہی اس ملک کے منتظم رہے۔ دوسرے امیدوار بڑھ بڑھ کر آگے آتے تھے مگر دھکیل دیے گئے کیونکہ ان کے ہوتے دوسرے منتظم کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے حملے زیادہ سے زیادہ بس حیثیت رکھتے تھے کہ جب کبھی یہ ذرا بگڑنے لگے تو کسی کو بھیج دیا گیا تاکہ انہیں متنبہ کر دے۔ مگر جب یہ بگڑتے ہی چلے گئے اور انہوں نے بناؤ کے

کام کم اور بگاڑ کے کام زیادہ کرنے شروع کر دئے، جب انہوں نے اخلاق میں وہ پستی اختیار کی جس کے آثار بام مارگی تحریک میں آپ اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جب انہوں نے انسانیت کو تقسیم کر کے خود اپنی ہی سوسائٹی کو ورنوں اور ذاتوں میں پھاڑ ڈالا اور اپنی اجتماعی زندگی کو ایک زینے کی شکل میں ترتیب دیا جس کی ہر سیڑھی کا بیٹھنے والا اپنے سے اوپر کی سیڑھی والے کا بندہ اور نیچے کی سیڑھی والے کا خدا بن گیا جب انہوں نے خدا کے لاکھوں کروڑوں بندوں پر وہ ظلم ڈھایا جو آج تک اچھوت پن کی شکل میں موجود ہے، جب انہوں نے علم کے دروازے عام انسانوں پر بند کر دئے اور ان کے پنڈت علم کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ گئے، اور جب ان کے کارفرما طبقوں کے پاس اپنے زبردستی جمائے ہوئے حقوق وصول کرنے اور دوسروں کی محنتوں پر داد عیش دینے کے سوا کوئی کام نہ رہا تو خدا نے آخر کار ان سے ملک کا انتظام چھین لیا اور وسط ایشیا کی ان قوموں کو یہاں کام کرنے کا موقع دیا جو اس وقت اسلام کی تحریک سے متاثر ہو کر زندگی کی بہتر صلاحیتوں سے آراستہ ہو گئی تھیں۔

یہ لوگ سینکڑوں برس تک یہاں کے انتظام پر سرفراز رہے۔ اور ان کے ساتھ خود اس ملک کے بھی بہت سے لوگ اسلام قبول کر کے شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے بہت کچھ بگاڑا بھی، مگر جتنا بگاڑا اس سے زیادہ بنایا۔ کئی سو برس تک ہندوستان میں بناؤ کا جو کام بھی ہوا انہی کے ہاتھوں ہوا یا پھر ان کے اثر سے ہوا۔ انہوں نے علم کی روشنی پھیلائی، خیالات کی اصلاح کی، تمدن و معاشرت کو بہت کچھ درست کیا، ملک کے ذرائع و وسائل کو اپنے عہد کے معیار کے لحاظ سے بہتری میں استعمال کیا، اور امن و انصاف کا عمدہ نظام قائم کیا جو اگرچہ اسلام کے اصلی معیار سے بہت کم تھا مگر پہلے کی حالت اور گرد و پیش کے دوسرے ملکوں کی حالت سے مقابلہ کرتے ہوئے کافی بلند تھا۔ اس کے بعد وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح بگڑنے لگے۔ ان کے اندر بھی بناؤ کی صلاحیتیں گھٹنی شروع ہوئیں اور بگاڑ کے میلانات بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بھی اونچ نیچ اور نسلی امتیازات اور طبقاتی تفریقیں کر کے خود اپنی سوسائٹی کو پھاڑ دیا جس کے بے شمار اخلاقی، سیاسی اور تمدنی نقصانات ہوئے۔ انہوں نے بھی انصاف کم اور ظلم زیادہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو بھول کر صرف اس کے فائدوں

اور زیادہ کرنا جائز اور حلال نظر آنے لگے۔ انہوں نے بھی تعمیر، ترقی اور اصلاح کے کام چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی قوتوں اور ذرائع کو ضائع کرنا شروع کیا اور اگر استعمال کیا بھی تو زیادہ تر زندگی کو بگاڑنے والے کاموں میں۔ یہ تن آسانی و عیش پرستی میں وہ اتنے کھوئے گئے کہ جب آخری شکست کھا کر ان کے فرماں رواؤں کو دلی کے لال قلعہ سے نکلنا پڑا تو ان کے شاہزادے ـــ وہی جو ملک کی حکومت کے امیدوار تھے ـــ جان بچانے کے لئے بھاگ بھی نہ سکتے تھے کیونکہ زمین پر چلنا انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی عام اخلاقی پستی اس حد کو پہنچ گئی کہ ان کے عوام سے لیکر بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں تک کسی میں بھی اپنی ذات کے سوا دوسری کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی جو انہیں دین فروشی، قوم فروشی اور ملک فروشی سے روکتی۔ ان میں ہزاروں لاکھوں پیشہ ور سپاہی پیدا ہونے لگے جن کی اخلاقی حالت پالتو کتوں کی سی تھی کہ جو چاہے روٹی دیکر انہیں پال لے اور پھر جس کا دل چاہے ان سے شکار کرالے۔ ان میں یہ احساس بھی باقی نہ رہا تھا کہ یہ ذلیل ترین پیشہ، جس کی بدولت اُن کے دشمن خود انہی کے ہاتھوں ان کا ملک فتح کر رہے تھے، اپنے اندر کوئی ذلت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ غالب جیسا شخص فخریہ کہتا ہے کہ "سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری" یہ بات کہتے ہوئے ہمارے اتنے بڑے شاعر کو ذرا خیال تک نہ گزرا کہ پیشہ ورانہ سپہ گری کوئی فخر کی چیز نہیں، ڈوب مرنے کی بات ہے۔

جب یہ ان کی حالت ہوگئی تو خدا نے ان کی معزولی کا بھی فیصلہ کرلیا اور ہندوستان کے انتظام کا منصب پھر نئے امیدواروں کے لئے کھل گیا۔ اس موقع پر چار امیدوار میدان میں تھے۔ مرہٹے، سکھ، انگریز اور بعض مسلمان رئیس۔ آپ خود انصاف کے ساتھ، قومی تعصب کی عینک اتار کر اس دور کی تاریخ اور بعد کے حالات کو دیکھیں گے تو آپ کا دل گواہی دیگا کہ دوسرے امیدواروں میں سے کسی میں بھی بناؤ کی وہ صلاحیتیں نہ تھیں جو انگریزوں میں تھیں، اور جتنا بگاڑ انگریزوں میں تھا اس سے کہیں زیادہ بگاڑ مرہٹوں، سکھوں اور مسلمان امیدواروں میں تھا۔ جو کچھ انگریزوں نے بنایا وہ ان میں سے کوئی نہ بناتا۔ اور جو کچھ انہوں نے بگاڑا اس سے بہت زیادہ یہ امیدوار بگاڑ کر رکھ دیتے۔ مطلقاً دیکھئے تو انگریزوں میں بہت سے پہلو بگاڑ کے، بے شمار برائیاں آپ کو نظر آئیں گی مگر مقابلتاً دیکھئے تو اپنے ہمعصر حریفوں سے ان کی برائیاں بہت کم اور ان کی خوبیاں بہت زیادہ نکلیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے قانون نے پھر ایک مرتبہ انسانوں سے ان [illegible] کو توڑ دیا جنہوں نے بگاڑ

حق کے بنا پر کہا ہے کہ "ہر ملک خود ملکیوں کے لئے ہے خواہ وہ اسے بنائیں یا بگاڑیں"۔ اس نے تاریخ کے اٹل فیصلے سے ثابت کیا کہ نہیں، ملک تو خدا کا ہے، وہی یہ طے کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کا انتظام کس کے سپرد کرے اور اس کا فیصلہ کسی نسلی، قومی یا آبائی حق کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ مجموعی بھلائی کون سے انتظام میں ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [1]

اس طرح اللہ تعالیٰ ہزاروں میل کے فاصلے سے ایک ایسی قوم کو لے آیا جو کبھی یہاں تین چار لاکھ کی تعداد سے زیادہ نہیں رہی اور اس نے یہیں کے ذرائع اور یہیں کے آدمیوں سے یہاں کی ہندو، مسلم، سکھ سب طاقتوں کو زیر کر کے اس ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہاں کے کروڑوں باشندے ان مٹھی بھر انگریزوں کے تابع فرمان بن کر رہے۔ ایک ایک انگریز نے تن تنہا ایک ایک ضلع پر حکومت کی۔ بغیر اس کے کہ اس کی قوم کا کوئی دوسرا فرد اس کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس کے پاس موجود ہوتا۔ اس تمام دوران میں ہندوستانیوں نے جو کچھ کیا پیش خدمت کی حیثیت سے کیا نہ کہ کارفرما کی حیثیت سے۔ ہم سب کو یہ ماننا پڑیگا، اور نہ مانیں گے تو حقیقت کو جھٹلائیں گے، کہ اس ساری مدت میں جبکہ انگریز یہاں رہے، بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہوا انگریزوں کے ہاتھوں سے اور ان کے اثر سے ہوا جس حالت میں انہوں نے ہندوستان کو پایا تھا اس کے مقابلہ میں آج کی حالت دیکھئے تو آپ اس بات سے انکار نہ کر سکیں گے کہ بگاڑ کے باوجود بناؤ کا بہت سا کام ہوا ہے جس کے خود اہل ملک کے ہاتھوں انجام پانے کی ہرگز توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ اس لئے تقدیر الٰہی کا وہ فیصلہ غلط نہ تھا جو اس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں کر دیا تھا۔

اب دیکھئے کہ جو کچھ انگریز بنا سکتے تھے وہ بنا چکے ہیں۔ ان کے بناؤ کے حساب میں اب کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس حساب میں جو اضافہ وہ کر سکتے ہیں وہ دوسروں کے ہاتھوں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر دوسری طرف اُن کے بگاڑ کا حساب بہت بڑھ چکا ہے اور جتنی مدت بھی وہ یہاں رہیں گے بناؤ کی بہ نسبت بگاڑ ہی

---

[1] کہو کہ خدایا، ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

زیادہ بڑھائیں گے ـــــ ان کی فردِ جرم اتنی لمبی ہے کہ اسے ایک صحبت میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس کے بیان کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ سب کے سامنے ہے ـــــ اب تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ یہاں کے انتظام سے بے دخل کر دئے جائیں۔ انہوں نے بہت عقلمندی سے کام لیا کہ خود سیدھی طرح رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ سیدھی طرح نہ جاتے تو ٹیڑھی طرح نکالے جاتے کیونکہ خدا کے اٹل قوانین اب ان کے ہاتھ میں یہاں کا انتظام رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

یہ موقع جس کے عین سرے پر ہم آپ کھڑے ہیں، تاریخ کے اُن اہم مواقع میں سے ہے جب زمین کا اصلی مالک کسی ملک میں ایک انتظام کو ختم کرتا ہے اور دوسرے انتظام کا فیصلہ کرتا ہے۔ بظاہر جس طرح یہاں انتقالِ اختیارات کا معاملہ طے ہوتا نظر آرہا ہے اس سے یہ دھوکا نہ کھاجائیے کہ یہ قطعی فیصلہ ہے جو ملک کا انتظام خود اہلِ ملک کے حوالے کئے جانے کے حق میں ہو رہا ہے۔ آپ شاید معاملہ کی سادہ سی صورت یہ سمجھتے ہوں گے کہ اجنبی لوگ جو باہر سے آکر حکومت کر رہے تھے واپس جارہے ہیں اس لئے اب یہ آپ سے آپ ہونا ہی چاہیئے کہ ملک کا انتظام خود ملکیوں کے ہاتھ آئے۔ نہیں، خدا کے فیصلے اس طرح کے نہیں ہوتے وہ ان اجنبیوں کو نہ پہلے بلا وجہ لایا تھا نہ اب بلا وجہ لے جارہا ہے۔ نہ پہلے الل ٹپ اس نے آپ سے انتظام چھینا تھا اور نہ اب الل ٹپ وہ اسے آپ کے حوالہ کر دیگا۔ در اصل اس وقت ہندوستان کے باشندے اُمیدوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب اُمیدوار ہیں۔ چونکہ یہ پہلے سے یہاں آباد چلے آرہے ہیں اس لئے پہلا موقع انہی کو دیا جارہا ہے۔ لیکن یہ مستقل تقرر نہیں ہے بلکہ محض امتحانی موقع ہے۔ اگر فی الواقع انہوں نے ثابت کیا کہ ان کے اندر بگاڑنے سے بڑھ کر بناؤ کی صلاحیتیں ہیں تب تو ان کا تقرر مستقل ہو جائیگا۔ ورنہ اپنے بناؤ سے بڑھ کر اپنا بگاڑ پیش کر کے یہ بہت جلدی دیکھ لیں گے کہ انہیں پھر اس ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائیگا اور دور و نزدیک کی قوموں میں سے کسی ایک کو اس خدمت کے لئے منتخب کر لیا جائیگا۔ پھر اس فیصلے کے خلاف یہ کوئی فریاد تک نہ کر سکیں گے۔ دنیا بھر کے سامنے اپنی نالائقی کا کھلا ثبوت دے چکنے کے بعد ان کا منہ کیا ہوگا کہ کوئی فریاد کریں اور ڈھیٹ بن کر فریاد کرینگے بھی تو اس کی داد کون دیگا۔

اب ذرا آپ جائزہ لیکر دیکھیں کہ ہندوستان کے لوگ، ہندو، مسلمان، سکھ اس امتحان کے

موقع ہے اپنے خدا کے سامنے اپنی کیا صلاحیتیں اور قابلیتیں اور اپنے کیا اوصاف اور کارنامے پیش کر رہے ہیں جن کی بنا پر یہ اُمید کر سکتے ہوں کہ خدا اپنے ملک کا انتظام پھر ان کے سپرد کردیگا۔ اس موقع پر اگر میں بے لاگ طریقے سے کھلم کھلا وہ فردِ جرم سُنا دوں جو اخلاق کی عدالت میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں، سب پر لگتی ہے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ بُرا نہ مانیں گے۔ اپنی قوم اور اپنے وطنی بھائیوں کے عیوب بیان کر کے خوشی تو مجھے بھی نہیں ہوتی حقیقت میں میرا دل روتا ہے، کیونکہ میں گویا اپنی آنکھوں سے اُس انجام کو دیکھ رہا ہوں جو ان عیوب کی بنا پر کل انہیں دیکھنا ہی نہیں، بھگتنا بھی پڑیگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ عیوب انہیں لے ڈوبیں گے۔ ہم، آپ، کوئی بھی ان کے انجام بد سے نہ بچے گا۔ اس لئے میں اُنہیں دلی رنج کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ جن کے کان ہوں وہ سنیں اور اصلاح کی کچھ فکر کریں۔

ہمارے افراد کی عام اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے، آپ اس کا اندازہ خود اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر کیجئے۔ ہم میں کتنے فیصدی آدمی ایسے پائے جاتے ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے میں، کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے میں، کوئی "مفید" جھوٹ بولنے اور کوئی "نفع بخش" بے ایمانی کرنے میں صرف اس بنا پر تامل کرتے ہوں کہ ایسا کرنا اخلاقاً بُرا ہے؟ جہاں قانون گرفت نہ کرتا ہو، یا جہاں قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی اُمید ہو وہاں کتنے فی صدی اشخاص محض اپنے اخلاقی احساس کی بنا پر کسی جرم اور کسی برائی کا ارتکاب کرنے سے باز رہ جاتے ہیں؟ جہاں اپنے کسی ذاتی فائدے کی توقع نہ ہو وہاں کتنے آدمی دوسروں کے ساتھ بھلائی، ہمدردی، ایثار، حق رسانی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں؟ ہمارے تجارت پیشہ لوگوں میں ایسے تاجروں کا اوسط کیا ہے جو دھوکے اور فریب اور جھوٹ اور ناجائز نفع اندوزی سے پرہیز کرتے ہوں؟ ہمارے صنعت پیشہ لوگوں میں ایسے افراد کا تناسب کیا ہے جو اپنے فائدے کے ساتھ کچھ اپنے خریداروں کے مفاد اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی مصلحت کا بھی خیال رکھتے ہوں؟ ہمارے زمینداروں میں کتنے ہیں جو غلہ روکتے ہوئے اور بے حد گراں قیمتوں پر بیچتے ہوئے یہ سوچتے ہوں کہ اپنی اس نفع اندوزی سے وہ کتنے لاکھ بلکہ کتنے کروڑ انسانوں کو فاقہ کشی کا عذاب دے رہے ہیں؟ ہمارے مالداروں میں کتنے ہیں جن کی دولتمندی میں کسی ظلم، کسی حق تلفی اور کسی بددیانتی کا دخل نہیں ہے؟ ہمارے محنت پیشہ لوگوں میں کتنے ہیں جو

فرض شناسی کے ساتھ اپنی اُجرت اور اپنی تنخواہ کا حق ادا کرتے ہیں؟ ہمارے سرکاری ملازموں میں کتنے ہیں جو رشوت اور خیانت سے، ظلم اور مردم آزاری سے، کام چوری اور حرام خوری سے، اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچے ہوئے ہیں؟ ہمارے وکیلوں میں، ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں میں، ہمارے اخبار نویسوں میں، ہمارے ناشرین و مصنفین میں، اور ہمارے قومی "خدمت گزاروں" میں کتنے ہیں جو اپنے فائدے کی خاطر ناپاک سے ناپاک طریقے اختیار کرنے اور خلق خدا کو ذہنی، اخلاقی، مالی اور جسمانی نقصان پہنچانے میں کچھ بھی شرم محسوس کرتے ہوں؟ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ ہماری آبادی میں مشکل ۵ فیصدی لوگ اس اخلاقی جذام سے بچے رہ گئے ہیں، ورنہ ۹۵ فیصدی کو یہ چھوت بُری طرح لگ چکی ہے۔ اس معاملہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہریجن کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ سب کے سب یکساں بیمار ہیں۔ سب کی اخلاقی حالت انتہائی خوفناک حد تک گری ہوئی ہے۔ اور کسی گروہ کا حال دوسرے سے بہتر نہیں ہے۔

اخلاقی تنزل کی یہ وبا جب افراد کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تو قدرتی بات تھی کہ وسیع پیمانے پر اجتماعی شکل میں اس کا ظہور شروع ہو جائے۔ اس آنے والے طوفان کی پہلی علامت ہمیں اس وقت نظر آئی جب جنگ کی وجہ سے ریلوں میں مسافروں کا ہجوم ہونے لگا وہاں ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جس خود غرضی، بیدردی اور سنگدلی کا سلوک کیا وہ پتہ دے رہا تھا کہ ہمارے عام اخلاق کس تیز رفتاری کے ساتھ گر رہے ہیں۔ پھر اشیاء کی کمیابی و گرانی کے ساتھ ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہوئی۔ پھر بنگال کا وہ ہولناک مصنوعی قحط رونما ہوا جس میں ہمارے ایک طبقہ نے اپنے ہی ملک کے لاکھوں انسانوں کو اپنے نفع کی خاطر بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ یہ سب ابتدائی علامات تھیں۔ اس کے بعد خباثت، کمینہ پن، درندگی اور وحشت کا وہ لاوا یکایک پھٹ پڑا جو ہمارے اندر مدتوں سے پک رہا تھا، اور اب وہ فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں ہندوستان کو ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک بھسم کر رہا ہے۔ کلکتہ کے فساد کے بعد سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش کا

جو نیا باب شروع ہوا ہے اس میں یہ تینوں قومیں اپنی ذلیل ترین صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں ۔ جن افعال کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی انسان کبھی ان کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے، آج ہماری بستیوں کے رہنے والے علانیہ ان کا ارتکاب کر رہے ہیں ۔ بڑے بڑے علاقوں کی پوری پوری آبادیاں غنڈہ بن گئی ہیں اور وہ کام کر رہی ہیں جو کسی غنڈے کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہ آئے تھے ۔ شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں پر رکھ کر ذبح کیا گیا ہے ۔ زندہ انسانوں کو آگ میں بھونا گیا ہے ۔ شریف عورتوں کو برسر عام ننگا کیا گیا ہے اور ہزاروں کے مجمع میں ان کے ساتھ بدکاری کی گئی ہے باپوں، شوہروں اور بھائیوں کے سامنے ان کی بیٹیوں، بیویوں اور بہنوں کو بے عزت کیا گیا ہے ۔ عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں پر غصہ نکالنے کی ناپاک ترین شکلیں اختیار کی گئی ہیں ۔ بیماروں اور زخمیوں اور بوڑھوں کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ مارا گیا ہے ۔ مسافروں کو چلتی ریل پر سے پھینکا گیا ہے ۔ زندہ انسانوں کے اعضاء کاٹے گئے ہیں ۔ نہتے اور بے بس انسانوں کا جانوروں کی طرح شکار کیا گیا ہے ۔ ہمسایوں نے ہمسایوں کو لوٹا ہے ۔ دوستوں نے دوستوں سے دغا کی ہے ۔ پناہ دینے والوں نے خود اپنی دی ہوئی پناہ کو توڑا ہے ۔ امن و امان کے محافظوں (پولیس اور فوج اور مجسٹریٹوں) نے علانیہ فساد میں حصہ لیا ہے، بلکہ خود فساد کیا اور اپنی حمایت و نگرانی میں فساد کرایا ہے ۔ غرض ظلم و ستم، سنگدلی و بے رحمی اور کمینگی و بدمعاشی کی کوئی قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا ارتکاب ان چند مہینوں میں ہمارے ملک کے رہنے والوں نے اجتماعی طور پر نہ کیا ہو ۔ اور ابھی دلوں کا غبار پوری طرح نکلا نہیں ہے ۔ آثار بتا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اور بدرجہا بدتر صورت میں ابھی ہونے والا ہے ۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ محض کسی اتفاقی ہیجان کا نتیجہ ہے؟ اگر یہ آپ کا گمان ہے تو آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ ابھی میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس ملک کی آبادی کے ۹۰ فی صدی افراد اخلاقی حیثیت سے بیمار ہو چکے ہیں ۔ جب افراد کی اتنی بڑی اکثریت بداخلاق ہو جائے تو قوموں کا اجتماعی رویہ آخر کیسے درست رہ سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں

قوموں میں سچائی، انصاف اور حق پسندی کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ راست باز، دیانت دار اور شریف انسان ان کے اندر نکو بن کر رہ گئے ہیں۔ برائی سے روکنا اور بھلائی کی نصیحت کرنا ان کی سوسائٹی میں ایک ناقابل برداشت جرم ہو گیا ہے۔ حق اور انصاف کی بات سننے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قوم کو وہی لوگ پسند ہیں جو اس کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور اغراض کی وکالت کریں، دوسروں کے خلاف اس کے تعصبات کو بھڑکائیں، اور اس کے جائز و ناجائز مقاصد کے لئے لڑنے کو تیار رہوں۔ اسی بنا پر ان قوموں نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے اندر سے بدترین آدمیوں کو چنا اور انہیں اپنا نمائندہ بنایا۔ انہوں نے اپنے اکابر مجرمین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور انہیں اپنا سربراہ کار بنا لیا۔ ان کی سوسائٹی میں جو لوگ سب سے زیادہ پست اخلاق، بے ضمیر اور بے اصول تھے وہ ان کی ترجمانی کے لئے اٹھے اور اخبار نویسی کے میدان میں وہی سب سے بڑھ کر مقبول ہوئے۔ پھر یہ سب لوگ بگاڑ کی راہ پر اپنی اپنی بگڑی ہوئی قوموں کو سرپٹ لے کر چلے۔ انہوں نے متضاد قومی خواہشات کو کسی نقطۂ انصاف پر جمع کرنے کے بجائے اتنا بڑھایا کہ وہ آخر کار نقطۂ تصادم پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے معاشی و سیاسی اغراض کی کشمکش میں غصے اور نفرت اور عداوت کا زہر ملایا اور اسے روز بروز بڑھاتے چلے گئے۔ انہوں نے برسوں اپنی اپنی زیر اثر قوموں کو اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کے انجکشن دے دے کر یہاں تک بھڑکایا کہ وہ جوش میں آ کر کتوں اور بھیڑیوں کی طرح لڑنے کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے عوام اور خواص کے دلوں کو ناپاک جذبات کی سنڈاس اور اندھی دشمنی کا تنور بنا کر رکھ دیا۔ اب جو طوفان آپ کی نگاہوں کے سامنے برپا ہے یہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو اچانک رونما ہو گئی ہو۔ یہ تو قدرتی نتیجہ ہے بگاڑ کے ان بے شمار اسباب کا جو مدتوں سے ہمارے اندر کام کر رہے تھے، اور یہ نتیجہ بس ایک ہی دفعہ ظاہر ہو کر نہیں رہ جائیگا بلکہ جب تک وہ اسباب اپنا کام کئے جا رہے ہیں یہ روز افزوں ترقی کے ساتھ ظاہر ہوتا چلا جائیگا۔ یہ ایک بس بھری فصل ہے جو برسوں کی تخم ریزی و آبیاری کے بعد اب پک کر تیار ہوئی ہے، اور اسے آپ کو اور آپ کی نسلوں کو نہ معلوم کب تک کاٹنا پڑیگا۔

حضرات آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ عین اس وقت جبکہ قانون قدرت کے مطابق اس ملک کی قسمت کا نیا انتظام درپیش ہے، ہم مالکِ زمین کے سامنے اپنی اہلیت و قابلیت کا کیا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ موقع تو یہ تھا کہ ہم اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے کہ اگر وہ اپنی زمین کا انتظام ہمارے حوالہ کریگا تو ہم اسے خوب بنا سنوار کر گلزار بنا دیں گے۔ ہم اس میں انصاف کریں گے، اسے ہمدردی اور تعاون اور رحمت کا گہوارہ بنائیں گے، اس کے وسائل کو اپنی اور انسانیت کی فلاح میں استعمال کریں گے، اس میں بھلائیوں کو پروان چڑھائیں گے اور برائیوں کو دبائیں گے۔ لیکن ہم اسے بتا رہے ہیں کہ ہم ایسے غارت گر، اس قدر مفسد اور اتنے ظالم ہیں کہ اگر تو نے یہ زمین ہمارے حوالہ کی تو ہم اس کی بستیوں کو اجاڑیں گے، محلّے کے محلّے اور گاؤں کے گاؤں پھونک دینگے، انسانی جان کو مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت کر دیں گے، عورتوں کو بے عزّت کریں گے، چھوٹے چھوٹے بچوں کا شکار کریں گے، بوڑھوں اور بیماروں اور زخمیوں پر بھی رحم نہ کھائیں گے، عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں تک کو اپنے نفس کی گندگی سے لیس دیں گے، اور جس زمین کو تو نے انسانوں سے آباد کیا ہے اس کی رونق ہم لاشوں اور جلی ہوئی عمارتوں سے بڑھائیں گے۔ کیا واقعی آپ کا ضمیر یہ گواہی دیتا ہے کہ اپنی یہ خدمات، یہ اوصاف، یہ کارنامے پیش کر کے آپ خدا کی نگاہ میں اس کی زمین کے انتظام کے لئے اہل ترین بندے قرار پائیں گے؟ کیا یہ کرتوت دیکھ کر وہ آپ سے کہے گا کہ "شاباش! اے میرے پرانے مالیوں کی اولاد تم ہی سب سے بڑھ کر میرے اس باغ کی رکھوالی کے قابل ہو۔ اسی اکھیڑ پچھاڑ، اسی اجاڑ اور بگاڑ، اسی تباہی و بربادی اور گندگی و غلاظت کے لئے تو میں نے یہ باغ لگایا تھا، لو اب اسے اپنے ہاتھ میں لے کر خوب خراب کرو!"

میں یہ باتیں آپ سے اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنے آپ سے اور اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ میں نہ خود مایوس ہوں، نہ کسی کو مایوس کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل میرا مدعا آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی حماقت اور جہالت سے اس زرین موقع کو کھونے پر تلے ہوئے ہیں جو کسی ملک کی قسمت بدلتے وقت صدیوں کے بعد خداوند عالم اس کے باشندوں کو دیا کرتا ہے۔ یہ وقت تھا

کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنے اعلیٰ اوصاف اور اپنی بہتر صلاحیتوں کا ثبوت پیش کرتے تاکہ خدا کی نگاہ میں انتظام زمین کے اہل قرار پاتے، مگر آج ان کے درمیان مقابلہ اس چیز میں ہو رہا ہے کہ کون زیادہ غارت گر، زیادہ سفاک اور زیادہ ظالم ہے تاکہ سب سے بڑھ کر خدا کی لعنت کا وہی مستحق قرار پائے۔ یہ چلن آزادی اور ترقی اور سرفرازی کے نہیں ہیں۔ ان سے تو اندیشہ ہے کہ کہیں پھر ایک مدت دراز کے لئے ہمارے حق میں غلامی اور ذلت کا فیصلہ نہ لکھ دیا جائے۔ لہٰذا جو لوگ عقل و ہوش رکھتے ہیں انہیں ان حالات کی اصلاح کے لئے کچھ فکر کرنی چاہیئے۔

اس مرحلہ پر آپ کے دل میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوگا کہ اصلاح کی صورت کیا ہے؟ میں اس کا جواب دینے کے لئے حاضر ہوں۔

اس تاریکی میں ہمارے لئے اُمید کی ایک ہی شعاع ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فی صدی لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جو اس عام بداخلاقی سے بچے ہوئے ہیں۔ یہی وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صالح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔ ہماری بدقسمتی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے، لیکن نیکی منظم نہیں ہے۔ نیک لوگ موجود ضرور ہیں، مگر منتشر ہیں۔ ان کے اندر کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔ کوئی تعاون اور اشتراکِ عمل نہیں ہے۔ کوئی لائحہ عمل اور کوئی مشترک آواز نہیں ہے۔ اسی چیز نے ان کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ اپنے گرد و پیش کی برائیوں کو دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہے، مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز اس کی تائید میں نہیں اُٹھتی تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص حق اور انصاف کی بات علانیہ کہہ بیٹھتا ہے، مگر منظم بدی زبردستی اس کا منہ بند کر دیتی ہے اور حق پسند لوگ بس اپنی جگہ چپکے سے اس کو داد دے کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا اور اس پر احتجاج کر گزرتا ہے، مگر ظالم لوگ ہجوم کر کے اسے دبا لیتے ہیں اور اس کا حشر دیکھ کر بہت سے ان لوگوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں جن کے ضمیر میں ابھی کچھ زندگی

باقی ہے۔ یہ حالت اب ختم ہونی چاہیے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار ہو جائیں، تو ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی وبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں اور اجتماعی طاقت سے اس بڑھتے ہوئے فتنے کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہو جائیں، اگر ان کا اپنا ذاتی اور جماعتی رویہ خالص راستی، انصاف، حق پسندی اور خلوص و دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو، اور اگر وہ مسائل زندگی کا ایک بہتر حل اور دنیا کے معاملات کو درست طریقہ پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں تو یقین جانئے کہ اس منظم نیکی کے مقابلہ میں منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتھیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا کر رہیگی۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے۔ اسے دھوکا ضرور دیا جا سکتا ہے، اور ایک بڑی حد تک مسخ بھی کیا جا سکتا ہے، مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو مادّہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اسے بالکل معدوم نہیں کیا جا سکتا۔ انسانوں میں ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو بدی ہی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں۔ اور ایسے لوگ بھی کم ہوتے ہیں جنہیں نیکی سے عشق ہو اور اسے قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان عام انسان نیکی اور بدی کے ملے جلے رجحانات رکھتے ہیں۔ وہ نہ بدی کے گرویدہ ہوتے ہیں اور نہ نیکی ہی سے انہیں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے کسی ایک طرف جھک جانے کا انحصار تمام تر اس پر ہوتا ہے کہ خیر اور شر کے علمبرداروں میں سے کون آگے بڑھ کر انہیں اپنے راستہ کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو، تو لامحالہ میدان علمبرداران شر ہی کے ہاتھ رہیگا اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبرداران شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخر کار اخلاق کے میدان میں ہوگا

اور اس میدان میں نیک انسانوں کو بُرے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ ایمانداری کے مقابلہ میں بے ایمانی، اور پاکبازی کے مقابلہ میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگالے، آخری جیت بہرحال سچائی، پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹھاس اور بُرے اخلاق کی تلخی کو چکھ لینے کے بعد آخرکار اس کا فیصلہ یہی ہو کہ مٹھاس سے تلخی زیادہ بہتر ہے۔

اصلاح کے لئے نیک انسانوں کی تنظیم کے ساتھ دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ ہمارے سامنے بناؤ اور بگاڑ کا ایک واضح تصور موجود ہو۔ ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ بگاڑ کیا ہے تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے، اور بناؤ کیا ہے تاکہ اسے عمل میں لانے پر سارا زور لگا دیا جائے۔ تفصیلات میں جانے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ میں بڑے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے ان دونوں چیزوں کی ایک تصویر پیش کرونگا۔

انسانی زندگی میں بگاڑ جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ان کو ہم چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

(۱) خدا سے بے خوفی، جو دنیا میں بے انصافی، بے رحمی، خیانت، اور ساری اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔

(۲) خدا کی ہدایت سے بے نیازی، جس نے انسان کے لئے کسی معاملہ میں بھی ایسے مستقل اخلاقی اصول باقی نہیں رہنے دئے ہیں جن کی پابندی کی جائے۔ اسی چیز کی بدولت اشخاص اور گروہوں اور قوموں کا سارا طرزِ عمل مفاد پرستی، لذت پرستی، اور خواہشات کی غلامی پر قائم ہوگیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ اپنے مقاصد میں جائز و ناجائز کی تمیز کرتے ہیں اور نہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے بُرے سے بُرے ذرائع اختیار کرنے میں انہیں ذرا سا تامل ہوتا ہے۔

(۳) خود غرضی، جو صرف افراد ہی کو ایک دوسرے کی حق تلفی پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ بڑے پیمانے پر نسل پرستی، قوم پرستی، اور طبقاتی امتیازات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے فساد کی بیشمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) جمود یا بے راہ روی، جس کی وجہ سے انسان، یا تو خدا کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال ہی نہیں کرتا، یا غلط استعمال کرتا ہے، یا تو خدا کے بخشے ہوئے ذرائع سے کام نہیں لیتا یا غلط کام لیتا ہے۔ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ کاہل اور نکمے لوگوں کو زیادہ دیر تک اپنی زمین پر قابض نہیں رہنے دیتا بلکہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا ہے جو کچھ نہ کچھ بنانے والے ہوں۔ دوسری صورت میں جب غلط کار قوموں کی تخریب ان کی تعمیر سے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہٹا کر پھینک دی جاتی ہیں اور بسا اوقات خود اپنی ہی تخریبی کارروائیوں کا لقمہ بنا دی جاتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں وہ چیزیں بھی، جن کی بدولت انسانی زندگی بنتی اور سنورتی ہے، چار ہی عنوانات کے تحت تقسیم ہوتی ہیں۔

(۱) خدا کا خوف، جو آدمی کو برائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لئے ایک ہی قابل اعتماد ضمانت ہے۔ راستبازی، انصاف، امانت، حق شناسی، ضبط نفس، اور وہ تمام دوسری خوبیاں جن پر ایک پُرامن اور ترقی پذیر تمدن و تہذیب کی پیدائش کا انحصار ہے، اسی ایک تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے عقیدوں کے ذریعہ سے بھی کسی نہ کسی حد تک انہیں پیدا کیا جا سکتا ہے، جس طرح مغربی قوموں نے کچھ نہ کچھ اپنے اندر پیدا کیا ہے، لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کا نشو و نما بس ایک حد پر جا کر رک جاتا ہے، اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد متزلزل رہتی ہے۔ صرف خدا ترسی ہی وہ پائدار بنیاد ہے جس پر انسان کے اندر برائی سے رکنے اور بھلائی پر چلنے کی صفت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتی ہے، اور محدود پیمانہ پر نہیں بلکہ نہایت وسیع پیمانے پر تمام انسانی معاملات میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

(۲) خدائی ہدایت کی پیروی، جو انسان کے شخصی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی رویہ کو اخلاق کے مستقل اصولوں کا پابند کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ جب تک انسان نے اخلاقی اصولوں کا خود واضع اور مصنف رہتا ہے، اس کے پاس باتیں بنانے کے لئے کچھ اور اصول ہوتے ہیں اور عمل میں لانے کے لئے کچھ اور۔ کتابوں میں آپ سے وہ ایک قسم کے اصول لکھتا ہے اور معاملات میں اپنے مطلب کے مطابق بالکل دوسری ہی قسم کے اصول برتتا ہے۔ دوسروں سے مطالبہ کرتے وقت اس کے اصول کچھ ہوتے ہیں اور خود معاملہ کرتے وقت کچھ۔ موقع اور مصلحت اور خواہش اور

ضرورت کے دباؤ سے اس کے اصول ہر آن بدلتے ہیں۔ وہ اخلاق کا اصل محور "حق" کو نہیں بلکہ "اپنے مفاد" کو بناتا ہے۔ وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ اس کے عمل کو حق کے مطابق ڈھلنا چاہئیے۔ اس کے بجائے وہ چاہتا ہے کہ حق اس کے مفاد کے مطابق ڈھلے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت افراد سے لیکر قوموں تک سب کا رویہ غلط ہو جاتا ہے اور اسی سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز انسان کو امن، خوش حالی اور فلاح وسعادت بخش سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ ایسے اصول ہوں جو کسی کے مفاد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حق کے لحاظ سے بنے ہوئے ہوں اور انہیں اٹل مان کر تمام معاملات میں ان کی پابندی کی جائے خواہ وہ معاملات شخصی ہوں یا قومی، خواہ وہ تجارت سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست اور صلح وجنگ سے۔ ظاہر ہے کہ ایسے اصول صرف خدائی ہدایت ہی میں ہمیں مل سکتے ہیں، اور ان پر عمل درآمد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان ان کے اندر ردوبدل کے اختیار سے دست بردار ہو کر انہیں قطعی واجب الاتباع تسلیم کرلے۔

(۳) نظام انسانیت، جو شخصی، قومی، نسلی اور طبقاتی خود غرضیوں کے بجائے تمام انسانوں کے مساوی مرتبے اور مساوی حقوق پر مبنی ہو جس میں بیجا امتیازات نہ ہوں جس میں اونچ نیچ چھوت چھات، اور مصنوعی تعصبات نہ ہوں جس میں بعض کے لئے مخصوص حقوق اور بعض کے لئے بناوٹی پابندیاں اور رکاوٹیں نہ ہوں جس میں سب کو نیکیاں پھلنے پھولنے کا موقع ملے جس میں انسان کی پستی وبلندی صرف اس کے اوصاف کی بنا پر ہو جس میں اتنی وسعت ہو کہ روئے زمین کے سارے انسان اس میں برابری کے ساتھ شریک ہو سکتے ہوں۔

(۴) عمل صالح یعنی خدا کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع کو پوری طرح استعمال کرنا اور صحیح استعمال کرنا۔

حضرات! یہ چار چیزیں ہیں جن کے مجموعہ کا نام "بناؤ" اور "صلاح" ہے۔ اور ہم سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہمارے اندر نیک انسانوں کی ایک ایسی تنظیم موجود ہو جو بگاڑ کے اسباب کو روکنے اور بناؤ کی ان صورتوں کو عمل میں لانے کے لئے پیہم جدوجہد کرے۔ یہ جدوجہد اگر اس ملک کے باشندوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئی تو خدا ایسا بے انصاف نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی زمین کا انتظام اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر کسی اور کو دیدے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ ناکام ہوئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا، آپ کا، اور اس ارض ہند کے رہنے والوں کا کیا انجام ہوگا!

روداد مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان

منعقدہ ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا اجتماع ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸ ستمبر ۴۸ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حسب ذیل ارکان شوریٰ شریک ہوئے

۱۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی
۲۔ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی
۳۔ ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز
۴۔ محمد عبد الجبار غازی صاحب
۵۔ قاضی حمید اللہ صاحب
۶۔ مولانا عبد الحق صاحب
۷۔ چوہدری علی احمد خاں صاحب
۸۔ خان سردار علی خاں صاحب
۹۔ طفیل محمد صاحب قیم جماعت

ان کے علاوہ حسب ذیل ارکان جماعت کو مسائل کی اہمیت کے پیش نظر خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

۱۔ چوہدری محمد اکبر صاحب
۲۔ مولانا حکیم عبد اللہ صاحب
۳۔ محمد باقر خاں صاحب
۴۔ سید عبد العزیز شرقی صاحب
۵۔ ابو السلام نعیم صدیقی صاحب
۶۔ سردار محمد اجمل خاں صاحب

یہ سب حضرات تمام اجلاسوں میں شریک رہے اور حسب ذیل تجاویز بالاتفاق طے ہوئیں۔

(۱) مجلس شوریٰ قائداعظم کی وفات پر اپنے دلی رنج والم کا اظہار کرتی ہے۔ ان کی مرکزی شخصیت وہ سب سے بڑی طاقت تھی جس پر اس عالم اسباب میں مسلمانوں کی قومی وحدت اور پاکستان کے استحکام و شیرازہ بندی کا انحصار تھا خصوصیت کے ساتھ موجودہ نازک

حالات میں جبکہ ملک کے اندر اور باہر خطرات و مشکلات کا ہجوم ہے، ہمارے درمیان سے ان کا اچانک اُٹھ جانا ایک بڑی قومی مصیبت ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان نقصانات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے جو ان کی وفات سے پہنچنے ممکن ہیں۔

۲۔ جماعت اسلامی کا یہ مستقل مسلک ہے کہ وہ ایک طرف اپنے نقطۂ نظر کے مطابق نظام زندگی کی اصلاح کے لئے کوشش کرتی رہتی ہے جس میں دوسروں سے اس کا اختلاف بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے، لیکن دوسری طرف جب قوم کے لئے اندرونی طور پر یا بیرونی طور پر کوئی نازک حالت پیدا ہوجائے تو اس کا مقابلہ کرنے میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر سب کے ساتھ تعاون کے لئے تیار رہتی ہے۔ اب چونکہ قائداعظم کی وفات سے ملک کی اندرونی طاقت کو ایک صدمۂ عظیم پہنچا ہے اور باہر بھی خطرات منڈلا رہے ہیں، اس لئے مجلس شوریٰ یہ بات واضح کردینا ضروری سمجھتی ہے کہ جماعت اسلامی اپنے اصلاحی مقصد اور نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہوئے پاکستان کی وحدت اور استحکام اور اس کی آزادی کی حفاظت کے لئے پوری کوشش کریگی اور جن جن صورتوں سے ممکن ہوگا اس معاملہ میں ملک کی دوسری جماعتوں اور حکومت سے پورا تعاون کریگی۔

۳۔ جماعت اسلامی کی رائے میں پاکستان کی فلاح و ترقی اور اس کے استحکام کے لئے پہلے بھی یہ ضروری تھا کہ اس کے ایک "اسلامی ریاست" ہونے کا جلد سے جلد آئینی طریق پر اعلان کردیا جائے۔ لیکن اب جبکہ قائداعظم کی شخصیت کا سہارا بھی باقی نہیں رہا ہے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہوگئی ہے۔ ایسا اعلان ہوجانے کے بعد دستوری اور قانونی تغیرات تدریج اپنے وقت پر ہوتے رہیں گے۔ لیکن اس اعلان سے اصولاً ہمارا نظام حکومت ایک اسلامی نظام میں تبدیل ہوجائے گا، مسلم عوام کو جو اس ریاست کی اصل طاقت ہیں قلب وضمیر کا مکمل اطمینان حاصل ہوجائے گا، ریاست کا نصب العین اور اس کے ارتقا کا راستہ متعین ہوجائیگا، اور وہ تمام قوتیں اس راستہ پر کام کرنے کے لئے جمع ہوسکیں گی

جو پاکستان کی اقتصادی بحالی اور اس کے مائل انتشار اجزا کی وحدت اور اہم تمدنی و معاشی مسائل کے حل اور اس کے دفاع کی مضبوطی کے لئے ضروری ہیں۔ نیز اس سے وہ نظری اختلافات بھی ختم ہو جائیں گے جو ملک کے آئندہ نظام کے متعلق ابھر رہے ہیں اور ذہنی انتشار پیدا کر رہے ہیں۔

۴۔ خواجہ ناظم الدین صاحب نئے گورنر جنرل کو مجلس کی طرف سے حسب ذیل پیغام بھیجا جائے:۔

"قائد اعظم کی وفات کے بعد اُن کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ جس نے یہ بوجھ آپ پر ڈالا ہے وہی اس کے سہارنے اور اس کا حق ادا کرنے کی طاقت بھی آپ کو بخشے۔ گورنر جنرل ہونے کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی ہے اس کے اندر ایک دینی سوچ پائی جاتی ہے اور نیک ارادوں کا نشان ملتا ہے جس کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ پاکستان کو روح اور قالب ہر دو حیثیتوں سے فی الواقع ایک "اسلامی ریاست" بنانے کی کوشش کریں گے آپ یقین رکھئے کہ اس مقصد کے لئے جو صحیح کوشش بھی آپ کریں گے، جماعت اسلامی اس میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کریگی"۔

۵۔ چونکہ کچھ مدت سے جہاد کشمیر کے متعلق امیر جماعت کی ایک فقہی رائے پر ملک میں اپنے انداز سے مخالفانہ پروپیگنڈا ہو رہا تھا جس سے ان کی ذات کے ساتھ جماعت اسلامی اور اس کی اصلاحی تحریک کو بھی لپیٹ میں لے لیا گیا تھا اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس معاملہ کو مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کیا جائے۔ مجلس اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہونچی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ

اُس حالت سے متعلق تھا جبکہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدود کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۶ ستمبر کو مجالس اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومت پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور وزیر خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے اس میں اس امر واقعہ کا اقرار و اظہار موجود ہے اور حکومت ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب چونکہ معاملہ کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے اور اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا، اس لئے مجلس شوریٰ امیر جماعت کی اس رائے کو زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ اس انکشاف کے بعد امیر جماعت اور مجلس شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہل پاکستان کے لئے جہاد کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے۔ کیونکہ اب دونوں مملکتوں کے درمیان اگر ایسے کوئی تعلقات ہیں تو اس کے صریح معنی یہ ہیں کہ ایک علاقہ میں حالت جنگ کا قیام اور دوسرے تمام علاقوں میں مصالحانہ روابط کا بقا فریقین کی رضامندی سے ہے۔

۶۔ جماعتِ اسلامی مسلمانان کشمیر کے مصائب، اور پاکستان کے لئے کشمیر کی اہمیت سے کبھی غافل نہیں تھی اور انڈین یونین کے بیجا تسلط سے اس اسلامی خطے کو بچانا فرض سمجھتی تھی لیکن اس کے لئے کسی دنیوی غرض و مصلحت کی خاطر ایسا طرز عمل اختیار کرنا ممکن نہ تھا جس کے شرعاً درست ہونے کا اسے اطمینان نہ ہو۔ اب چونکہ اس فرض کی ادائیگی میں کوئی شرعی مانع باقی نہیں رہا ہے اس لئے جماعت محض مسلمانوں کو مسئلہ بتانے پر اکتفا نہ کرے گی بلکہ انشاء اللہ خود بھی اس جہاد میں عملی حصہ لے گی۔ اس کام کے لئے عملی نقشہ امیر جماعت حسب ذیل رفقا کی مدد سے بنائیں گے:۔

محمد عبدالجبار غازی صاحب۔ چودھری علی احمد خاں صاحب۔ محمد باقر خاں صاحب

۷۔ پچھلے چند مہینوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ جماعت اسلامی اور اس کے مقصد، طریق کار اور

نظام کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں جن سے نہ صرف عوام بلکہ حکومت بھی متاثر ہوتی نظر آتی ہے، اس لئے مجلسِ شوریٰ حسب ذیل تصریحات کرنا ضروری سمجھتی ہے تاکہ جو کوئی بھی اس جماعت سے موافقت یا مخالفت کرے وہ ہماری اصل پوزیشن کو سمجھ لینے کے بعد کرے :۔

۱۔ "جماعت اسلامی" ایک مستقل جماعت ہے جو اگست ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا مقصد طریق اور نظام دوسری جماعتوں سے جدا ہے۔ کسی دوسری جماعت سے اس کا کوئی تعلق نہ کبھی تھا اور نہ اب ہے۔

۲۔ اس جماعت کا مقصد اول روز سے یہ رہا ہے کہ اسلام کے کسی جز یا بعض اجزا کو نہیں بلکہ پورے اسلام کو اس کی اصلی شکل اور روح کے ساتھ انفرادی زندگیوں میں اور اجتماعی نظام میں عملاً قائم کیا جائے۔ اجتماعی نظام سے ہم وہ پورا مجموعہ مراد لیتے ہیں جس میں تمدن معاشرت، معیشت، سیاست سب کچھ شامل ہے، اور ہماری جدوجہد اس غرض کے لئے ہے کہ یہ سب کچھ ان اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دئیے ہیں۔

۳۔ یہ جماعت اسی چیز میں تمام انسانیت کی بہتری سمجھتی ہے، اس لئے بالعموم اس نے انسانوں کو بلالحاظ نسل و قومیت اس کی دعوت دی ہے۔ اسی چیز میں اسے مسلمانوں کی فلاح بھی نظر آتی ہے، اس لئے مسلمانوں کو بھی وہ یہی تلقین کرتی ہے کہ پورے اسلام کو اپنی پوری زندگی میں عملاً قائم کریں۔ اور قیام پاکستان کے بعد اسی چیز میں وہ پاکستان کی بھلائی بھی دیکھتی ہے، اس لئے اس کی کوشش یہ ہے کہ اس ملک کا نظامِ زندگی سراسر اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے۔

۴۔ اپنے اس مقصد کے لئے یہ جماعت ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ وہ اصلاح و انقلاب کے لئے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے، یعنی تبلیغ و تلقین کے

ذریعہ سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو اُن تغیرات کے لئے ہموار کیا جائے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ جماعت کا کوئی کام خفیہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ علانیہ ہے۔ جن قوانین پر ملک کا نظم و نسق اس وقت چل رہا ہے، ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتی بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے۔ جو لوگ ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں انہیں ہٹانا یا خود ان کی جگہ لینا اس کے مدنظر نہیں ہے بلکہ وہ انہیں ہم خیال بنانا چاہتی ہے، اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو پھر جمہوری طریقوں پر انہیں ایسے لوگوں سے بدلنا چاہتی ہے جو اصلاح یافتہ رائے عام کے نزدیک صالح ہوں۔

۵۔ اس جماعت کا نظام اسلامی جمہوریت کے اصولوں پر ہے۔ اس کا "رکن" ہر وہ شخص بن سکتا ہے جو جماعت کے عقیدے (Party Creed) اور نصب العین کو قبول کرے اور دستور جماعت کے مطابق رکنیت کی شرائط پوری کرے۔ یہ ارکان امیر جماعت کا انتخاب کرتے ہیں۔ مجلس شوریٰ بھی ارکانِ جماعت ہی کی منتخب کردہ ہے۔ امیر مجلس شوریٰ کے مشورے سے کام کرتا ہے۔ امیر کے کام پر جماعت کے ہر فرد کو تنقید اور محاسبہ کرنے کا آزادانہ حق ہے۔ وہ اسی وقت تک امیر رہ سکتا ہے جب تک اس کی دیانت اور بصیرت پر جماعت کو اعتماد رہے۔ جونہی وہ اس اعتماد کو کھو دے جماعت اس کو معزول کر کے دوسرا امیر منتخب کر سکتی ہے۔ جماعت کا دستور یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو امارت یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا کسی ذمہ داری کے منصب کے لئے منتخب نہ کیا جائے جو اس کا اُمیدوار ہو اور اس کے لئے کینوسنگ (Canvassing) کرے۔ اُمیدواری کے طریقے کو چھوڑ کر جماعت نے اپنے ہاں انتخاب کے وہ طریقے اختیار کئے ہیں جو اسلام میں ہیں۔ نظام جماعت کی اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ زمانہ جدید کی اصطلاحات کے مطابق یہ ایک جمہوری طرز کی پارٹی ہے اور اس کا امیر ایک پارٹی لیڈر کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا محض اس بنا پر کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ہم نے جدید اصطلاحوں کے

چھوڑ کر اصل اسلامی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

۶۔ یہ جماعت اپنے تمام معاملات میں اس اصول پر سختی کے ساتھ کاربند ہے کہ قرآن اور سنت میں جو کچھ خدا اور رسول کا حکم ہے وہی ہمارے لئے اصل قانون اور اصل ہدایت ہے۔ وہ کسی امر میں فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اٹھانے کے لئے پہلے یہ دیکھتی ہے کہ خدا اور رسول کی ہدایت کیا ہے، پھر مصلحتوں اور حالات اور ضرورتوں کو ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھتی ہے جہاں تک اسلام میں اس کی گنجائش ہے۔

۷۔ قوم، ریاست اور حکومت کے ساتھ اس جماعت کے تعلق کی نوعیت یہ ہے:۔

ا۔ ہماری قوم چونکہ مسلمان ہے اس لئے ہم اسلام کے منشا کے مطابق اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس اصلاحی کوشش کے ساتھ ہماری روش یہ ہے کہ اپنی قوم کے تمام جائز مقاصد اور تمام جائز کاموں میں ہم اس کے شریک ہیں، اور جس کام کو ہم اپنے علم میں خلاف شرع پاتے ہیں اس سے الگ رہتے ہیں لیکن خواہ مخواہ مزاحمت بھی نہیں کرتے، اِلّا یہ کہ دیانتاً ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہو جائے۔

ب ریاست ابھی عبوری دور میں ہے۔ ابھی تک آئینی طور پر اس کی نوعیت متعین نہیں ہوئی ہے مگر چونکہ یہ مسلمان قوم کی کوششوں سے قائم ہوئی ہے اور قوم نے اسلامی جذبات کی بنا پر اس کے قیام کی کوشش کی تھی، اس لئے توقع یہی ہے کہ اس کی دستوری بنیادیں اسلامی ہونگی۔ دوسری طرف کچھ غیر اسلامی قوتیں بھی ملک میں کارفرما ہیں، اس وجہ سے یہ اندیشہ بھی ہے کہ کہیں غیر اسلامی بنیادوں پر اس کا دستور نہ بن جائے۔ ہم دوسرے تمام مخلص اہل دین کے ساتھ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس اندیشے کا سدباب ہو اور وہ توقعات پوری ہو جائیں جو ہم اور عام مسلمان رکھتے ہیں۔ اس عبوری دور میں ریاست کے ساتھ ہمارا معاملہ اس توقع پر مبنی ہے کہ یہ قطعی طور پر ایک اسلامی ریاست بنے گی اگر ہماری یہ توقعات پوری ہو گئیں تو اسلامی ریاست کی خدمت اور اس کی وفاداری عین ہمارا

جزو ایمان ہوگی۔ اور اگر خدانخواستہ یہ ایک غیر دینی (   ) ریاست بنادی گئی تو ہم اس کی وفاداری کے لئے ہرگز تیار نہ ہوں گے بلکہ اسے ویسی ہی طاغوتی ریاست سمجھیں گے جیسی کہ سابق انگریزی حکومت تھی۔ مگر انگریزی حکومت کے دور میں بھی ہمارے وفادار نہ ہونے کے معنی یہ نہیں تھے کہ ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کیا جائے، یا ریاست کو توڑنے کی ایسے طریقوں سے کوشش کی جائے جس سے نظم کی جگہ بدنظمی لے لے، یا ریاست کے خلاف اس کی کسی دشمن طاقت سے سازباز کیا جائے۔ اس وقت بھی ہم ریاست کو غیر دینی سے دینی بنانے کے لئے پُرامن طریقوں ہی سے کوشش کر رہے تھے۔ اسی طرح اگر خدانخواستہ ہماری یہ ریاست غیر دینی ہو گئی تو ہم پُرامن اور جمہوری طریقوں ہی سے اس کو ایک دینی ریاست میں تبدیل کرنے کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہیں گے اور ہماری عدم وفاداری کبھی غداری اور انارکزم (Anarchism) کی شکل نہیں اختیار کرے گی۔

ج ریاست اور قوم کی خیرخواہی کے لئے حکومت پر تنقید کرنا اور اس کی اصلاح کی کوشش کرنا ہم اپنا حق سمجھتے ہیں اور کسی حال میں اس سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہماری تنقید کبھی تخریبی نہیں رہی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ کام کرنے والوں پر اس لئے نکتہ چینی کریں کہ وہ کام نہ کر سکیں۔ ہماری تنقید ہمیشہ تعمیری ہوتی ہے، یعنی ہم ایجابی طور پر (Positively) اصلاح کی ایک صورت اور بہتر کام کی ایک شکل پیش کرتے ہیں اور تنقید اس لئے کرتے ہیں کہ غلط کاموں کا نقصان اور بہتری کی ضرورت کا احساس پبلک کے بھی ذہن نشین ہو اور کارپردازان حکومت کے بھی۔

ہم کارکنان حکومت، حکومت اور ریاست کے درمیان اصولی فرق کو واضح طور پر ملحوظ رکھتے ہیں اور عمال حکومت سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ براہ کرم وہ خود بھی

اپنی کارروائیوں میں اس فرق کو ملحوظ رکھیں۔ نیز حکومت سے ہم یہ بھی گذارش کرتے ہیں کہ وہ ملک میں ایسے حالات برقرار رکھے جن میں سیاسی نظام کی تبدیلی کے لئے صرف رائے عام کی تبدیلی کافی ہو۔ اسی میں قوم اور ملک اور ریاست کی فلاح ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ملک کے اصلاح طلب رجحانات غلط راستوں پر چل جائیں گے جن سے خیر کی توقع کم اور شر کا اندیشہ بہت زیادہ ہے۔

۸۔ چونکہ حکومت کے حلقوں میں جماعت اسلامی کے متعلق یہ شکایت پائی جاتی ہے کہ وہ سرکاری ملازموں کی وفاداری کو متزلزل کر رہی ہے لہٰذا اس بارے میں بھی ہم اپنا موقف صاف صاف واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ اسلام کی رو سے غیر مشروط وفاداری صرف اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہے۔ باقی ہر ایک کی وفاداری، حتیٰ کہ خود اسلامی حکومت کی وفاداری بھی اصولاً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس وفاداری کے تقاضے خدا اور رسول کی وفاداری کے تقاضوں سے متصادم نہ ہوں۔ اب جبکہ انگریزی اقتدار کا دور ختم ہو گیا ہے، اور حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو ہمارے دینی بھائی ہیں، ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حکمران مغربی نظریات کو چھوڑ کر اسلامی تصورات اختیار کریں۔ ریاست اور اس کے آئین کے لئے غیر مشروط وفاداری کا مطالبہ اپنی عین حقیقت ہی کے لحاظ سے مغربی نظریات پر مبنی ہے اور یہ بھی انہی نظریات کا نتیجہ ہے کہ جو ملازم اس مطالبہ کو خدا اور رسول کی وفاداری کے ساتھ مشروط کرے اس کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اول تو ریاست کو ایسا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے، اور مزید برآں اگر کوئی مسلمان ملازم اس مطالبہ کو اس شرط کے ساتھ مشروط کرے تو ایک صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والا حکمران کبھی اس کے اس فعل پر یہ شک نہیں کریگا کہ ایسا ملازم اعتماد کے لائق نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ تو یہ محسوس کریگا کہ جس ملازم نے یہ شرط لگائی ہے وہی سب سے بڑھ کر اعتماد کے قابل ہے، کیونکہ

یہ اس کی راستبازی اور اس کے ضمیر کی زندگی کا صریح ثبوت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت اس چیز کو بالکل غلط معنی میں لے رہی ہے، اور اس نے حلف وفاداری کے معاملہ میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے وہ ایسے لوگوں کے دائرہ ملازمت میں آنے اور رہنے کو تو نہیں روک سکتی جو وفاداری کا حلف لے کر بھی غداریاں کر سکتے ہیں، لیکن ان لوگوں کی خدمات سے قوم اور ریاست کو محروم کر دیگی جن کی دیانت اور اخلاص اور فرض شناسی پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ صوبہ سرحد میں حکومت کے جبر و تشدد نے جو شکلیں اختیار کی ہیں ان کے بعض پہلو ایسے افسوسناک ہیں کہ مجلس شوریٰ ان پر اظہار خیال کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ پچھلے دنوں نوشہرہ میں جماعت اسلامی کے تین کارکن گرفتار کیے گئے اور بعض پولیس افسروں نے ان کو نہایت گھٹیا درجہ کی بازاری زبان میں فحش گالیاں دیں۔ ایک اور کارکن کی گرفتاری کے لئے پولیس ان کے مکان پر پہنچی۔ وہ وہاں موجود نہ تھے پولیس نے غالباً اس شبہ پر کہ ان کے گھر والے ان کو چھپا رہے ہیں، ان کے بوڑھے والد اور ان کے بچوں کو زدو کوب کیا۔ ان بیہودگیوں کو تو یہ سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ یہ انگریزی دور کی بگڑی ہوئی عادتیں ہیں جو ابھی کچھ مدت تک اپنا رنگ دکھاتی رہیں گی۔ مگر تازہ کارروائی یہ ہے کہ کل ہی ہماری ضلع کوہاٹ کی جماعت کے امیر، مولٰنا معین الدین صاحب کو جو اسی ضلع میں مدرسہ سراج الاسلام موضع کاہی کے مدرس رہ چکے ہیں اور اسی ضلع کے باشندے بھی ہیں، گرفتار کیا گیا اور دفعہ ۵۵/۱۰۹ کے تحت آوارہ گردی کے الزام میں ان کا چالان کر دیا گیا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، یہ تو کبھی انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی نہ ہوا تھا کہ جن لوگوں سے حکومت کو سیاسی اسباب کی بنا پر اختلاف ہوا انہیں اخلاقی الزامات میں پھانسنے کی کوشش کی جائے۔ اگر یہ حرکات بعض حکام حکومت بطور خود کر رہے ہیں تو صوبہ سرحد کی حکومت کا فرض ہے کہ اپنے ایسے کارکنوں کو ادب سکھائے۔ اور اگر یہ سب کچھ خود حکومت کی پالیسی کے مطابق ہو رہا ہے تو ہم خان عبدالقیوم خاں صاحب کی وزارت سے صرف اتنا کہیں گے کہ جو لوگ قوم اور ریاست کی بہتری کے لئے آپ سے مختلف رائے رکھتے ہیں ان کو اگر آپ طاقت سے دبانا چاہیں تو ضرور ایسا کیجئے

مگر یہ کام شریفانہ طریقوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے جو طریقے آپ اختیار کر رہے ہیں ان سے نہ آپ کی عزت ہی میں کوئی اضافہ ہوگا، اور نہ کسی گروہ کے سیاسی اقتدار کو مستحکم کرنے میں ایسے طریقے کبھی مفید ثابت ہوئے ہیں۔

۹۔ مسلم لیگ کی حکومتیں بعض صوبوں میں "پبلک سیفٹی ایکٹ" کا استعمال جس آزادی کے ساتھ کر رہی ہیں، وہ اس مجلس کے نزدیک سخت تعجب انگیز ہے۔ ابھی اس دور کو کچھ بہت زیادہ دن نہیں گزرے ہیں جب مسلم لیگ خود اس قانون کے خلاف شدت کے ساتھ معترض تھی۔ اب اپنی حکومت کے زمانے میں یہ پارٹی وہی ہتھیار خود استعمال کر رہی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ دوسروں کے لئے ناجائز تھا وہ ان کے لئے جائز ہوگیا ہے؟ دراصل "پبلک سیفٹی ایکٹ" اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار سے قانون کی نفی ہے جسے مصنوعی طور پر قانون کی شکل دیدی گئی ہے۔ اس قسم کے قوانین صرف وہ حکومتیں استعمال کیا کرتی ہیں جن کے وجود کے لئے کوئی اخلاقی جواز باقی نہیں رہتا، جو صرف زبردستی کے بل پر ہی اپنے آپ کو قائم رکھ سکتی ہیں، جنہیں خود بھی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ انصاف اب ان کی جانب نہیں ہے۔ اگر ان حکومتوں نے اس حد تک گر جانے کا ارادہ کر لیا ہے تو ہم ان کو پیغام تعزیت دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ پچھلے دنوں جماعت اسلامی کے خلاف ملک میں جس بے حیائی کے ساتھ علانیہ جھوٹا اور گندا پروپیگنڈا ہوا ہے اس پر مجلس صرف اس حیثیت سے افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ ہمارے بہت سے بھائیوں نے محض ہماری ضد میں اپنے اخلاق کو خراب اور اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کیا۔ اس کا یہ پہلو بھی افسوسناک ہے کہ ہمارے ملک کے عوام اور خواص کا ایک بہت بڑا طبقہ اس قدر آسانی کے ساتھ جھوٹ اور فریب کا شکار ہو سکتا ہے اور سب سے زیادہ افسوس کے قابل مغربی پنجاب کی حکومت کا حال ہے کہ اس نے عین اس موقع پر، جبکہ جماعت کے خلاف روز تہمتیں، جھوٹ گھڑ گھڑ کر پھیلائے جا رہے تھے "کوثر" اور "تسنیم" کی اشاعت حکماً بند کر دی، تاکہ یہ کام آسانی کے ساتھ ہو سکے، اور جماعت کے پاس اس کی تردید کا کوئی ذریعہ نہ رہے۔ حکومت نے اپنے سرکاری اعلان میں اپنی اس کارروائی

کے جو وجوہ بیان کئے ہیں ان کی حیثیت ایک بے بنیاد بہانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم پورے زور کے ساتھ کہتے ہیں کہ حکومت ان دونوں اخبارات کے خلاف اپنے الزامات کو کسی کھلی عدالت میں ثابت نہیں کر سکتی۔ یہ طرز عمل ایک ذمہ دار حکومت کے منصب سے بہت فروتر ہے کہ وہ غیر ذمہ دار اور پست اخلاق اخبار نویسوں کے مرتبے تک گر جائے۔

۱۱۔ جماعت کے آئندہ کام کے سلسلے میں مجلس شوریٰ کارکنوں کو حسب ذیل ہدایات دیتی ہے:۔

۱۔ ملک کی حفاظت کے لئے خود پوری طرح تیار ہوں اور دوسرے مسلمانوں کو اس تیاری کی ضرورت کا احساس دلائیں۔ ہم اس ملک کو اسلام کے لئے بچانا چاہتے ہیں لہٰذا یہ ہمارا دینی فریضہ ہے اور اسی جذبے سے ہم کو اس کام کی طرف سب سے بڑھ کر توجہ کرنی چاہئے۔ تمام کارکنوں کو چاہئے کہ ہوم گارڈس، اے۔ آر۔ پی، اور دوسرے دفاعی نظاموں کی تربیت کے لئے سرکاری طور پر جو انتظامات کئے گئے ہیں ان میں پورا پورا حصہ لیں۔ نیز خود تربیت حاصل کر کے اپنے گھر کی خواتین کو بھی ان چیزوں کی تربیت دیں اور پھر ان کے ذریعہ سے اپنے محلے اور بستی کی عورتوں کو بھی تربیت دینے کا انتظام کریں۔

۲۔ ہمیں اب اپنی قوم کی اخلاقی و ذہنی حالت درست کرنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ کام کرنا ہے۔ ایک آزاد قوم، جسے اپنے بل بوتے پر جینا ہو، محض فوجی تربیت اور عسکری تنظیم کے بل پر نہیں جی سکتی۔ اس کے لئے انفرادی سیرت کی مضبوطی، اجتماعی اخلاق کی صلاحیت، اور شعور و ادراک کی صحت بھی درکار ہے، بلکہ اصل طاقت یہی ہے۔ قریب کے زمانے میں ہماری قوم کو پے درپے جو ٹھوکریں اٹھانی پڑی ہیں ان میں سب سے زیادہ جس چیز کا دخل رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اندر قابل اعتماد سیرت رکھنے والے افراد بہت کم ہیں، ہمارے اجتماعی اخلاق میں بہت سی کمزوریاں موجود ہیں، اور ہمارے عوام ہی نہیں خواص تک کا شعور ابھی تک اس درجے پر نہیں پہنچا ہے کہ وہ اپنے رہبروں کے انتخاب میں دھوکا نہ کھائیں۔ اب ہم ایسے نازک موڑ پر پہنچ گئے ہیں کہ ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے اگر کوئی غیر معمولی جدوجہد نہ کی گئی تو خدانخواستہ شاید تلافی

کا بھی کوئی موقعہ نہ مل سکے گا۔

۳۔ رفقاء جماعت کو انفرادی طور پر اور تمام حلقوں، ضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو اجتماعی طور پر خود اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر اب پہلے سے زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ اپنے مقصد میں ہماری کامیابی کا سارا انحصار اسی امر پر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے ساتھ ہمارا اپنا تعلق مضبوط ہو، ہمارے اندر تقویٰ اور خشیت موجود ہو، ہمارے معاملات درست ہوں اور ہم اپنی جماعتی زندگی میں صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مشابہت حاصل کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ انشاء اللہ ہمیں اپنی قوم کو اس تنزل سے نکالنے میں کامیابی نصیب ہوگی۔ لہٰذا نظام اسلامی کے قیام اور اصلاح خلق کی جدوجہد میں منہمک ہو کر ہمارے رفقاء خود اپنے حال سے غافل نہ ہو جائیں بلکہ اپنی اخلاقی و دینی حالت کو درست رکھنے اور زیادہ بہتر بنانے کے لئے پیہم کوشاں رہیں۔

۴۔ تمام حلقوں اور ضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو اپنے ارکان اور ہمدرد کارکنوں میں ایسے نوجوانوں کو تلاش کرنا چاہیے جو اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں رکھتے ہوں اور جن میں ایسا جوہر قابل پایا جاتا ہو کہ اگر انہیں اچھی علمی اور اخلاقی تربیت دی جائے تو وہ تحریک اسلامی میں تعمیر اور رہنمائی کے مناصب سنبھالنے کے قابل ہو سکتے ہوں۔ ایسے اشخاص جہاں جہاں بھی ہوں، انہیں منتخب کر کے راولپنڈی کی تربیت گاہ میں بھیجنے کا انتظام کیا جائے اور اگر وہ اپنے مصارف کے خود متحمل نہ ہو سکتے ہوں تو ان کی مالی کفالت کا بار ان کے حلقے یا ضلع یا مقام کی جماعتیں اپنے ذمہ لیں۔

خاکسار
طفیل محمد قیم جماعت
شعبہ تنظیم جماعت اسلامی۔ اچھرہ۔ لاہور
پاکستان
مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء

رسائل و مسائل

نظام شریعت میں غلاموں کی حیثیت

"میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ امید کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائینگے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگا اور اس پر تعداد کی کوئی قید نہ ہوگی؟

(۲) کیا اس نظام شریعت میں لونڈی و غلام کی خرید و فروخت (علاوہ ان لونڈی غلام کے جو جنگی قیدی ہوں) بھی پاکستان کے اندر جائز ہوگی جس طرح آجکل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے"؟

جو سوالات آپ نے کئے ہیں ان کا مختصر جواب تو ہاں اور نہیں کی شکل میں دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہوگی۔ اس لئے میں ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں۔

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ایسی حالت میں دی گئی ہے جبکہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہو، نہ تو قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو، نہ فدیہ لے کر ہمارے قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔ آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں وہ یا تو انہیں قتل کرے گی، یا انہیں عمر بھر اس قسم کے "انسانی باڑوں" میں رکھے گی جنہیں آجکل (Concentration Camps) کہا جاتا ہے اور کسی قسم کے انسانی حقوق دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کیلئے

بھی زیادہ مفید نہیں ہے جس میں اس طرح کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کردیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کردی جائے۔ اس طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک قیدی کو ایک ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا اس میں اس امر کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیران جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی لونڈی یا غلام اپنے مالک سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کرکے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں، تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اسے از روئے قانون ایک خاص مدت تک کے لئے اس کو مہلت دینی ہوگی اور اس مدت میں اگر وہ اپنی فدیہ کی رقم ادا کردے تو اسے آزاد کردینا پڑے گا۔

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے، اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کردیتا ہے۔ قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو آپ پوری طرح اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب کہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا آپ کو اتفاق ہوا ہو۔ فوجی سپاہی سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا بھی کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآنہ ہوسکے اس کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے تو یہ لوگ بلائے جان بن جاتے۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جب کہ نہ ان کا تبادلہ ہوا اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہوسکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں

ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتی ہیں۔ تو نری عصمت کے لحاظ سے ملک یمین اور عقد نکاح میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ اس صورت میں تو خود حکومت باقاعدہ قانون کے تحت ایک عورت کو ایک مرد کے حوالے کرتی ہے۔ اس عورت کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو جنسی تعلق رکھنے کا حق نہیں رہتا۔ جو اولاد اس سے ہو اس کا نسب اسی شخص سے ثابت ہوتا ہے اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہوتی ہے جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد۔ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا اور مالک کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انھیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ اگر لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو؟ لیکن بعد کے زمانوں میں امراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا لیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشا کے بالکل خلاف تھا۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشا کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے۔

حجاز میں جو بردہ فروشی آجکل ہوتی ہے اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اصولی طور پر میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ جنگ کے سوا دوسرے طریقے سے آزاد انسانوں کو پکڑنا اور ان کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے۔

نظام اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب

جن لوگوں سے پاکستان کے آئندہ نظام کے متعلق گفتگو ہوتی ہے وہ اکثر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ اور دوسرے اہل علم اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تاکہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے۔ اس سوال سے صرف مجھ کو ہی نہیں دوسرے کارکنوں کو بھی اکثر و بیشتر سابقہ پیش آتا ہے۔ گو ہم اپنی حد تک لوگوں کو بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ آپ اس سوال کا جواب ترجمان القرآن میں دیں تاکہ وہ بہت سی غلط فہمیاں

صاف ہو سکیں جن پر یہ سوال مبنی ہے۔

آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مفصل جواب تو سردست نہیں دیا جا سکتا، لیکن مختصر طور پر میں ایک بات عرض کرونگا جس سے اُمید ہے کہ آپ معاملہ کی اصل حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو، نہ اخلاق اسلامی، جہاں کا سیاسی و معاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو، اور جہاں ایک مجرد سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی نوبت آگئی ہو، وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی سی بات پر آنکا جا رہا ہو کہ ہم ایک دستور مرتب کر کے پیش کر دیں اور برسراقتدار لوگ اسے یکدم نافذ کر دیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بینک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا خاکہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے معلمین یا بنک کے اسٹاف کو دیدیا جائے تاکہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید دستور کو انہوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے!

واضح طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:۔

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملہ میں اتنے مخلص اور اپنے اُن وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کئے تھے اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی اُن بنیادی امور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لئے اصولاً ضروری ہیں (جنہیں ہم نے اپنے "مطالبہ" میں بیان کر دیا ہے)، پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے، پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع

دیا جائے کہ وہ زمام کار سنبھالنے کے لئے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لئے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بسہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور وارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقہ کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ پاکستان کے قیام کے لئے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آگیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہوگا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں، اور اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے، جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔

امید ہے کہ اس توضیح سے لوگ ہماری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ ہم کوئی کام وقت سے پہلے نہیں کرنا چاہتے۔ سردست ہم نے اسلامی نظام کے بنیادی امور کو ایک مطالبہ کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے تو دستور سازی کے کام میں جس حد تک ممکن ہوگا ہم پوری مدد کریں گے۔ لیکن اگر سرے سے یہ بنیادی امور ہی برسر اقتدار لوگوں کو منظور نہ ہوں تو پھر دستور کا خاکہ پیش کرنے سے آخر کیا فائدہ متصور ہے؟

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	(زیر طبع)	ہیگل مارکس اور نظام اسلام	(زیر طبع)
رسالہ دینیات	۱/۸/-	رسالہ دینیات (انگریزی) نیا ایڈیشن	۳/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-	اسلام کیا ہے (انگریزی) نیا ایڈیشن	۱/۸/-
مسئلہ قومیت	۱/۸/-	الحاد کے بعد کیا (")	-/۱۲/-
مسئلہ جبر و قدر	۱/-/-	سلامتی کا راستہ	-/۶/-
تجدید و احیائے دین	۱/-/-	اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۸/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-/-	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	-/۸/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۴/-	انسان کا معاشی مسئلہ	-/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۴/-	اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-	نئے نظام تعلیم	-/۶/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/-/-	ہندوستان میں تحریک اسلامی کا ائندہ لائحہ عمل	-/۸/-
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/-	دین حق	-/۶/-
پردہ	۲/۸/-	اسلام اور جاہلیت	-/۶/-
تنقیحات	۲/۸/-	ایک اہم استفتا	-/۳/-
خطبات نیا ایڈیشن	(زیر طبع)	دستور جماعت اسلامی	-/۳/-
تفہیمات	۳/۸/-	روداد جماعت اسلامی حصہ	۱/-/-
حقیقت توحید	۱/۲/-	روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۱۲/-
اسلام اور ضبط ولادت	۱/-/-	روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	(زیر طبع)
مسئلہ سود (زیر طبع)	۳/۸/-	روداد اجتماع خواتین	(زیر طبع)

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

ذیلدار پارک اچھرہ - لاہور (پاکستان)